چلو ہم ہار جاتے ہیں

حناء ملک

چلو ہم ہار جاتے ہیں............حنا ملک

شام کے سائے گہرے پڑنے لگے تھے شفاف نیلے آسمان پر آشیانوں کی جانب لوٹتے پرندوں کے غول اڑ رہے تھے' جاڑوں کی یہ اداس سی شام دھیرے دھیرے رات کی جانب سفر کر رہی تھی۔ دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے وہ ایک ٹک ڈھلتے سورج کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

''میرو بیٹا!'' داجی کی آواز پر وہ چونکی۔ ''اندر آ جاؤ بیٹا' ٹھنڈ بڑھ رہی ہے۔'' روزانہ کی طرح وہ ایک سرد آہ بھرتی' کپڑے جھاڑتی' اٹھ کھڑی ہوئی۔ یہ روز کا معمول تھا۔ عصر کے بعد سے وہ روزانہ سبزے سے ڈھکے اس چھوٹے سے ٹیلے پر بیٹھا کرتی تھی اور اسی طرح شام ڈھلتے ہی داجی اسے پکار کر اندر بلا لیا کرتے تھے۔

''چلیں' آپ کی دوا کا وقت ہو گیا ہے۔'' داجی چھڑی سنبھالے ہولے ہولے اپنے کمرے کی طرف چلنے لگے تھے تب وہ بھی ہمراہ ہو لی۔

''لڑکی ہمیں تمہاری یہ عادت بہت بری لگتی ہے۔'' وہ مصنوعی خفگی سے بولے۔

''کون سی عادت بھلا؟'' وہ دھیرے سے مسکرائی۔

''دوا کا وقت یاد رکھنے والی عادت۔'' وہ ناک بھوں چڑاتے ہوئے بولے۔

''افسوس! میری ایک ہی عادت تو اچھی ہے۔ وہ بھی آپ کو ناپسند ہے۔ داجی آپ کی میرو تو بہت ہی نکمی نکلی۔''

''خبردار لڑکی! جو میری میرو کو نکمی کہا۔ میری میرو تو اس دنیا کی سب سے اچھی بیٹی ہے۔'' داجی کی پیار بھری دھونس پر وہ دھیرے سے مسکرا دی۔ داجی کو دوا دینے کے بعد وہ ان کے لئے کھانا بنانے کچن میں چلی آئی۔ کھانا وغیرہ بنانے کے لئے کک تھا مگر داجی کے لئے پرہیزی کھانا وہ اپنے ہاتھ سے بنایا کرتی تھی۔ کھانا بنانے کے بعد وہ داجی کے کمرے میں چلی آئی۔

''کھانا تیار ہے۔'' وہ شوخی سے بولتی اندر داخل ہوئی مگر یکلخت ہی قدم دروازے میں ہی ساکت ہو گئے۔ داجی کے بیڈ کے قریب ہی کرسی ڈالے وہ خاصے ریلیکس انداز میں بیٹھا تھا۔ میرب پر ایک نگاہ غلط ڈال کر اس نے خاصا برا سا منہ بناتے ہوئے نظروں کا زاویہ بدلا تھا۔ وہ عادی تھی ایسے رویے کی' تبھی دھیرے سے چلتی داجی کے بیڈ کے دوسری جانب آ کھڑی ہوئی۔

''داجی! میں آپ سے بعد میں بات کروں گا۔'' بیڈ کی پائنتی پر دھرا کوٹ اٹھاتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس سے پہلے کہ داجی کچھ کہتے' وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمرے سے باہر چلا گیا۔ داجی نے تاسف سے پہلے دروازے اور پھر میرب کی طرف دیکھا جو اپنی جگہ چور سی بنی بیٹھی تھی۔ سالار آفندی کا یہ رویہ شروع دن سے اس کے لئے تحقیر و اہانت بھرا تھا۔

''لیجئے داجی' مزیدار سا ویجی ٹیبل سوپ' وہ لہجے میں بشاشت بھر کر بولی مگر اس کا چہرہ چغلی کھا رہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ سالار کے رویے سے ہرٹ ہو جاتی تھی۔ حالانکہ جانتی تھی یہ روز کا معمول تھا۔

''وہ دل کا برا نہیں ہے بیٹا' بس ذرا......'' ہمیشہ کی طرح جلال خان آفندی نے اسے دلاسا دینا چاہا۔

''افوہ داجی' سوپ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' وہ زبردستی چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولی۔ داجی ایک سرد آہ بھر کر سوپ کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''چھوٹے خان نے کھانا کھا لیا؟'' اس نے کچن میں موجود گل رانو سے پوچھا۔

''نئیں بی بی' وہ بولا ام کو بوک (بھوک) نئیں اے۔'' گل رانو نے میرب کے ہاتھ سے خالی برتنوں کی ٹرے لیتے ہوئے کہا۔ وہ ایک سرد آہ بھرتی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

❀❀❀

''رحمت خان' ناشتہ!'' گمبھیر لہجہ' بھاری آواز' سب نوکر الرٹ ہو گئے۔ چھوٹے خان کے غصے سے سب کی جان جاتی تھی۔ دو سیکنڈ میں ناشتا اس کے سامنے تھا۔

''کچھ اور خاناں؟'' رحمت خان مودب سا پاس ہی کھڑا تھا۔

''نہیں۔ داجی کہاں ہیں؟'' ناشتے سے فارغ ہو کر اس نے گل رانو سے پوچھا۔

''وہ تو جی میرو بی بی کے ساتھ باہر گیا۔''

''ہونہہ۔'' ہنکارا بھرتا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ گاڑی کے قریب ہی پہنچا تھا جب داجی کا بازو تھامے وہ ہولے ہولے چلتی گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ گہرے نیلے اور سیاہ پرنٹ کے سوٹ کے ساتھ سیاہ شال اوڑھے' ٹھنڈ سے سرخ پڑتے چہرے میں وہ ماحول کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہی تھی۔

''السلام علیکم داجی!''

''وعلیکم السلام' صبح صبح کہاں چل دیئے برخوردار؟''

''میرا دوست آ رہا ہے' اسے لینے جا رہا ہوں۔''

''اچھی بات ہے' اسے گھر ہی لے آنا۔ میرو بیٹا! مہمان خانہ صاف کروا دینا گل رانو سے کہہ کر۔''

''جی بہتر۔'' اس کے کہنے پر سالار خان نے ایک اچٹتی سی نگاہ اس پر ڈالی۔

''داجی! آپ کو کتنی بار کہا ہے اتنے سرد موسم میں باہر نہ جایا کریں' جنہیں شوق ہے وہ خود جایا کریں۔'' تند سے لہجے میں کہتا وہ بے حد خود غرض لگا تھا۔ میرب چپ چاپ وہاں سے چلی گئی۔

''سالار! کیوں کرتے ہو ایسا؟ میں نے ضد کی تھی باہر جانے کی۔ وہ تو انکار کر رہی تھی۔''

''گستاخی معاف داجی' آپ ہمیشہ سے اس کی باتوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے آئے ہیں۔''

''وہ غلط نہیں ہے' پردہ ہمیشہ غلطیوں پر ڈالا جاتا ہے' سالار خان۔'' جلال خان دبے دبے جوش سے گویا ہوئے۔

''آیئے میں آپ کو اندر تک چھوڑ دوں۔'' وہ نرم سے لہجے میں کہتا ان کا بازو تھامنے لگا۔

''ابھی ان بوڑھی ہڈیوں میں اتنی طاقت ہے کہ چند فرلانگ کا فاصلہ اپنے قدموں پر طے کر سکوں۔'' وہ خفا خفا سے آگے بڑھ گئے۔

سالار خان اپنے عزیز از جان دادا کو خفا نہیں دیکھ سکتا تھا مگر ایک میرب احسان کا معاملہ ایسا تھا جس میں وہ جھکنے کو تیار نہیں تھا۔

دوپہر میں وہ واپس آیا تو تنہا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ اس کا کوئی دوست بھی تھا جسے مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا تھا۔

''گل رانو! کھانا لگواؤ۔'' وہ کچن میں داخل ہوتے ہی بولا مگر اگلے ہی لمحے لب بھینچ گیا۔ وہاں میرب احسان موجود تھی۔ جسے وہ گل رانو سمجھا تھا میرب' داجی کے لئے سوپ بنا رہی تھی۔ سالار کی آواز پر فوراً پلٹی تھی مگر وہ اپنی بات کر کے جا چکا تھا۔ ہر بار سالار کا سامنا ہونے پر وہ ایک نئی ذلت سے دوچار ہوتی تھی۔ اس کے لہجے سے ہی نہیں اس کی نگاہوں سے' اس کے ہر ہر عمل سے میرب کے لئے محض تحقیر اور نفرت ٹپکتی تھی۔ روز کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور ہو جاتی تھی جس پر وہ محض خون کے گھونٹ بھر کر رہ جاتی تھی۔

''ہاں مجھ سے اچھے تو اس گھر کے نوکر ہیں' جن سے کم از کم تم بات کرنا تو گوارہ کر لیتے ہو سالار آفندی۔'' دل ہی دل میں کڑھتی وہ سوپ بنانے لگی۔ داجی کو سوپ پلانے کے بعد وہ انہی کے پاس بیٹھی' ان کو کوئی کتاب پڑھ کر سنا رہی تھی جب سالار آفندی کی دہاڑ سنائی دی۔ وہ گل رانو پر برس رہا تھا۔ آدھے گھنٹے سے زیادہ ہو گیا تھا اور ابھی تک کھانا نہیں لگا تھا۔ سالار اور اس کا دوست کھانا لگنے کا انتظار کر رہے تھے۔

''جب میں کہہ کر گیا تھا کہ کھانا لگواؤ تو ابھی تک کھانا کیوں نہیں لگوایا؟'' وہ برس رہا تھا اور سامنے کھڑی گل رانو تھر تھر کانپ رہی تھی۔ میرب بے اختیار زبان دانتوں تلے دبا گئی۔ وہ گل رانو کو چھوٹے خان کے حکم سے آگاہ کرنا بھول گئی تھی اور ایسا پہلی بار ہوا تھا۔

''خان......ام تو باہر گیا تھا' ام کو تو کسی نے نئیں بتایا کہ......'' گل رانو ہمت کر کے منمنائی تھی۔ تبھی سالار کی نظر دروازے کی چوکھٹ پر کھڑی میرب سے ٹکرائی تھی جو غالباً شور سن کر وہاں چلی آئی تھی۔ سالار نے ایک زہر آلود نگاہ اس پر ڈالی اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا' اس کے سامنے آ رکا۔ ایک لمحے کو وہ بھی کانپ کر رہ گئی۔ جانے نوکروں کے سامنے وہ اس کی کس طرح عزت افزائی کر ڈالے۔

''مجھے زچ کرنے کے یہ اوچھے ہتھکنڈے ہیں میرب احسان۔'' چبا چبا کر بولتا وہ میرب کی روح تک فنا کر گیا۔ ہمیشہ کی طرح وہ اپنی بات مکمل کر کے رکا نہیں تھا۔ ''جانے اس شخص کے دل سے بدگمانی کی گرد دھو پاؤں گی بھی یا نہیں۔'' وہ ایک سرد آہ بھرتی واپس مڑ گئی۔

❀❀❀

میرے ہم سفر تجھے کیا خبر

یہ جو وقت ہے دھوپ چھاؤں کے کھیل سا

اسے دیکھتے!

اسے جھیلتے!

میری آنکھ گرد سے اٹ گئی

میرے خواب ریت میں کھو گئے

میرے ہاتھ برف سے ہو گئے

وہ جو راستوں کا یقین تھے

وہ جو منزلوں کے امین تھے

وہ نشان پا بھی مٹا دیئے

تیرے ہاتھ سے میرے ہاتھ تک

وہ جو ہاتھ بھر کا تھا فاصلہ

کئی موسموں میں بدل گیا

میرے ہم سفر' تجھے کیا خبر

لکھتے لکھتے اچانک اسے احساس ہوا جیسے وہ کسی کی گہری نظروں کے حصار میں ہے۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا تو سٹپٹا گئی۔ کچھ ہی فاصلے پر وہ اجنبی موجود تھا۔ میرب کے دیکھنے پر اس نے دھیرے سے مسکراہٹ پاس کی۔ گویا خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کیا۔ وہ حسب معمول عصر کے بعد اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھی تھی۔ موسم بے حد خوشگوار ہو رہا تھا۔ ڈھلتی شام میں سبزے کے بیچ گھری وہ گہرے زرد اور نارنجی سوٹ میں اس شام کا حصہ معلوم ہو رہی تھی۔ یہ چھوٹا سا ٹیلہ' جس پر بیٹھ کر وہ دور افق کے پار ڈھلتے سورج اور بلند و بالا پہاڑوں اور ہر سو پھیلے سبزے کو دیر تک تکا کرتی تھی' وسیع و عریض ''آفندی لاج'' کے احاطے میں موجود تھا۔ چاروں طرف کی نشاندہی کی گئی تھی۔ گھر کے احاطے میں موجود اجنبی یقیناً سالار آفندی کا دوست تھا ورنہ کسی کی جرات نہیں تھی بغیر اجازت ''آفندی لاج'' میں قدم رکھتا۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر اندر جانے لگی تو وہ پکار بیٹھا۔

''ایکسکیوز می مس......'' میرب کے بڑھتے قدم تھم سے گئے مگر وہ پلٹی نہیں تھی۔ جبھی وہ اس کے سامنے آ رکا۔

''یہ غالباً آپ کا ہے'' سلور اور میرون خوبصورت سا قلم میرب کی طرف بڑھایا۔

''تھینک یو۔'' اس کے ہاتھ سے قلم لے کر وہ وہاں رکی نہیں تھی جبکہ صارم کی نگاہوں نے دور تک اس کا تعاقب کیا تھا۔

صارم اور سالار کی دوستی کو پانچ برس ہونے والے تھے۔ امریکہ میں ہی دونوں کی دوستی ہوئی تھی۔ سالار اور صارم ایک ہی یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔ تعلیم مکمل ہونے کے بعد سالار تو وطن واپس آ گیا تھا جبکہ صارم نے وہیں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کر لی تھی۔ آج کل ایک

ماہ کی چھٹیوں پر پاکستان آیا ہوا تھا تو سالار سے ملنے ایبٹ آباد چلا آیا تھا۔

''داجی! آپ کا یہ پوتا تھوڑا اکھڑ اور غصیلا ہے۔ یہ تو میں جانتا تھا مگر یہاں آ کر جو اس کا سخت گیر سا انداز دیکھا تو واقعی لگا کہ سالار آفندی کا تعلق روایتی خاندان سے ہے۔'' صارم کے کہنے پر سالار دھیرے سے مسکرایا تھا۔ داجی نے بہت دنوں بعد اس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی تھی۔

''بیٹا یہ باہر سے جتنا سخت گیر اور غصیلا ہے اندر سے اتنا ہی نرم طبع اور پیار کرنے والا ہے۔ بالکل اپنے باپ کی طرح۔ وہ بھی ایسا ہی تھا' جبکہ داور اندر باہر سے ایک جیسا تھا۔ بہت حساس' نرم دل اور پیار کرنے والا'' داجی داور کا ذکر کرتے ہوئے آبدیدہ ہو گئے۔ اسی لمحے میرب نے لاؤنج میں قدم رکھا تھا' وہ شاید کہیں باہر گئی ہوئی تھی۔ داجی کا آخری جملہ وہ بھی سن چکی تھی تبھی سالار کی نظر میرب پر پڑی تو وہ محض دانت کچکچا کر رہ گیا۔ میرب نے سر جھکا لیا۔ حالانکہ جو کچھ ہوا تھا' اس میں اس کا کوئی قصور نہ تھا مگر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی احساسِ جرم کا شکار ہونے لگتی تھی جب جب سالار خان کا سامنا ہوتا تھا۔

''داور بھائی کہاں ہوتے ہیں آج کل؟ جب سے میں آیا ہوں ان سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔'' صارم اپنی دھن میں بولے جا رہا تھا جبکہ لاؤنج میں موجود باقی تین نفوس بالکل ساکت ہو گئے تھے۔ جامد خاموشی کو داجی نے توڑا۔ سرد آہ بھر کر میرب کی طرف دیکھا۔

''آؤ میرو بیٹا' اندر آ جاؤ۔'' داجی کے پکارنے پر وہ بمشکل خود کو گھسیٹتی ان تک پہنچی تھی۔ سالار آفندی کی آنکھیں لہو رنگ ہو رہی تھیں۔

''ان سے ملو یہ صارم ہیں' سالار کے دوست اور صارم بیٹا یہ ہماری بہت پیاری سی بیٹی ہے میرب۔'' داجی کے تعارب کروانے پر اس نے دھیرے سے سر کے اشارے سے سلام کیا۔ سالار کی خون چھلکاتی نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ فوراً اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر دروازہ بند کرتے ہی وہ وہیں دروازے کے ساتھ لگ کر نیچے بیٹھتی چلی گئی۔ آنسو ایک تواتر سے بہہ رہے تھے۔

''کیوں ہوا میرے ساتھ ایسا۔ کوئی جرم نہ ہوتے ہوئے بھی میں خود کو مجرم سمجھنے پر مجبور ہو جاتی ہوں۔ سالار آفندی کی الزام دیتی نگاہیں مجھے زندگی سے نفرت کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔'' وہیں گھٹنوں میں سر دیئے وہ بری طرح سسکنے لگی تھی۔

''ایک کپ چائے ملے گی؟'' صارم کی آواز پر وہ چونک کر پلٹی تھی۔ داجی کے لئے کھانا بنا رہی تھی جب صارم وہاں چلا آیا تھا۔

''آپ نے کیوں زحمت کی' رحیم خان کو کہہ دیا ہوتا۔'' میرب کے کہنے پر صارم مبہم سا مسکرایا تھا' اب وہ اسے کیا بتاتا' جسے وہ زحمت کہہ رہی ہے' اس کے لئے عین سعادت ہے۔ وہ جب سے یہاں آیا تھا' روزانہ اس لڑکی کو اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھا کرتا تھا۔ جب وہ عصر کے بعد اپنی مخصوص جگہ پر آ کر بیٹھا کرتی تھی تیکھے نقوش' بڑی بڑی غلافی آنکھیں' سرخ و سپید رنگت اور بالوں کی موٹی سی چٹیا بنائے' یہ لڑکی سادگی و پرکاری کا نمونہ تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ صارم نے اس سے زیادہ حسین لڑکیاں نہیں دیکھی تھیں' وہ جس دیس سے آیا تھا' وہاں تو حسن قدم قدم پر بکھرا ہوتا ہے مگر اس لڑکی میں کوئی خاص بات تھی جو مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچتی تھی۔

میرب کو اس کے اس طرح دیکھنے پر الجھن سی محسوس ہوئی۔

''گل رانو' صاحب کے لئے چائے بنا دو۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں ناگواری در آئی۔ داجی کے لئے کھانا ٹرے میں لگاتی وہ اس کے پاس سے گزر کر کچن سے باہر چلی گئی۔ صارم سر جھٹک کر دھیرے سے مسکرا دیا۔

میرب کو سالار آفندی کے اس دوست سے نامعلوم سی چڑ ہو چلی تھی۔ وہ یقیناً سالار کا منہ چڑھا دوست تھا جو یوں آزادی سے پورے گھر میں دندناتا پھرتا تھا۔ وہ صارم کی نگاہوں میں اپنے لئے پسندیدگی دیکھ چکی تھی اور یہ بات اس کے لئے خاصی پریشان کن تھی۔

اس روز اس کا جی چاہ رہا تھا ڈھلتی شام کے منظر کو کینوس پر منتقل کر دے۔ مصوری اس کا شوق تھی مگر اس نے اس کے لئے کہیں سے باقاعدہ تربیت حاصل نہیں کی تھی۔ قدرتی طور پر اس کے ہاتھ میں خاصی صفائی اور مہارت تھی اور وہ اکثر محض اپنے شوق کی تسکین کی خاطر پینٹنگ کر لیا کرتی تھی۔ وہ اپنے کام میں اس قدر محو تھی کہ پتہ ہی نہ چلا کب صارم وہاں آن کھڑا ہوا۔ وہ بڑی دلچسپی سے اس کے چہرے

اور کبھی کینوس پر رنگ بکھیرتے اس کے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔ بالوں کا ڈھیلا ڈھالا سا جوڑا بنا رکھا تھا۔ چند آوارہ لٹیں چہرے کے اطراف میں اٹھکیلیاں کر رہی تھیں۔ دو تین برش بالوں کے جوڑے میں پھنسائے وہ خاصی دلچسپ لگ رہی تھی۔ تبھی اس کی نظر صارم پر پڑی۔

''اوہ آپ! کب آئے؟''

''مجھے آئے ہوئے تو خیر سے اکتیس برس ہونے والے ہیں۔'' وہ شرارت سے مسکرایا تھا۔ میرب کو اس کا یہ مذاق بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ وہ پھر سے کینوس کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''سوری! آپ کو میرا مذاق کرنا برا لگا۔'' اس کے چہرے پر پھیلی ناگواری دیکھتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔

''اٹس اوکے۔ ویسے بھی آپ کا اور میرا مذاق کا کوئی رشتہ بنتا بھی نہیں ہے۔'' وہ رنگوں کو سمیٹنے لگی تھی۔ تسلسل برقرار نہیں رہا تھا اور اب اس کا موڈ بھی نہیں تھا۔

''رشتہ نہیں ہے مگر بنایا تو جا سکتا ہے ناں۔'' بات ذومعنی تھی' ایک لمحے کو میرب کے ہاتھ تھم سے گئے۔

''ایکسکیوزمی۔'' وہ کنی کترا کر گزر جانا چاہتی تھی جب وہ راہ میں حائل ہوگیا۔

''میں نے کوئی ناممکن بات تو نہیں کی۔''

''آپ سالار آفندی کے دوست ہیں اس لئے میں اتنا لحاظ کر رہی ہوں۔'' اس کا لہجہ خود بخود سخت ہوگیا تھا۔

''مجھ میں کیا کمی ہے؟ میں آپ کو اپنانا چاہتا ہوں۔ بہت عزت و پیار کے ساتھ۔ صرف آپ کی مرضی درکار ہے۔ باقی میں خود سنبھال لوں گا۔'' صارم کا لہجہ ٹھوس تھا۔ یقیناً وہ مصمم ارادہ کر چکا تھا۔ ایک لمحے کو تو میرب احسان گنگ سی کھڑی رہ گئی۔

''پھر آپ کی خاموشی کو میں کیا سمجھوں؟'' وہ مصر تھا۔

''دیکھئے آ......آپ......'' وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر جانے کیوں الفاظ حلق میں اٹک کر رہ گئے تھے۔

''میں آج شام کو یا شاید کل صبح تک واپس چلا جاؤں گا مگر جانے سے پہلے آپ کی رائے جاننا میرے لئے بے حد ضروری ہے۔''

''میں شادی نہیں کرنا چاہتی اور نہ ہی ایسا ممکن ہے۔'' اس کا لہجہ گلوگیر ہوگیا۔

''شادی ناممکن کیسے ہوسکتی ہے؟ شادی نہیں کرنا چاہتیں یا مجھ سے شادی کرنے پر اعتراض ہے؟'' وہ سراپا سوال بنا کھڑا تھا جبکہ میرب کو لگ رہا تھا جیسے مارے ضبط کے اس کی کنپٹیاں پھٹ جائیں گیں۔

''کیا جانتے ہیں آپ میرے بارے میں؟'' وہ عجیب سے انداز میں اسے دیکھنے لگی تھی۔

''یہی کہ آپ سالار کی کزن ہیں۔ ماشاءاللہ تعلیم یافتہ ہیں اور......''

''میں داور خان آفندی کی بیوہ ہوں۔'' یکلخت اس کے بولنے پر صارم کی زبان کو بریک لگ گئے۔ یہ انکشاف اس کے لئے بے حد حیرت انگیز تھا۔

''داور خان کی بیوہ؟ تو کیا داور اس دنیا میں نہیں رہا اور سالار نے اسے بتایا تک نہیں اور داور نے شادی کب کی؟'' سالار کو امریکہ سے آئے ہوئے چند ماہ ہوئے تھے۔ چند ماہ پہلے تک تو ایسی کوئی بات اس کے علم میں نہیں تھی۔ وہ یہ لرزہ خیز انکشاف کرنے کے بعد وہاں رکی نہیں تھی۔ جبکہ صارم کافی دیر گم صم سا وہاں کھڑا رہا۔

انجانے میں ہی سہی' صارم اس کے ایسے زخموں کو چھیڑ بیٹھا تھا جن پر گزرتے وقت نے بڑی مشکل سے مرہم رکھا تھا۔ سرِ شام ہی وہ اپنے کمرے میں بند ہوگئی تھی۔ داجی سے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے وہ اپنے کمرے میں مقید ہوگئی تھی۔ رات دھیرے دھیرے بیت رہی تھی اور وہ سلگتی ہوئی موم بتی کی طرح قطرہ قطرہ پگھل رہی تھی۔ ماضی کی تکلیف دہ یادیں اس کے پور پور کو زخمی کئے دے رہی تھیں۔ وہ چاہ کر بھی ان اذیت بھری یادوں کو اپنی یادداشت سے مٹا نہیں پاتی تھی۔ مٹانا چاہتی بھی تو سالار آفندی کا لہجہ' اس کی الزام دیتی نگاہیں' اسے کچھ بھی بھولنے نہیں دیتا تھا۔

❁❁❁

شفاعت شاہ کا تعلق ایک باا ثر جاگیر دار خاندان سے تھا۔ ان کے تین بیٹے تھے' سب سے بڑے سبحان شاہ' پھر فیضان شاہ اور احسان شاہ' شفاعت شاہ روایتی وڈیروں کی طرح بے حد سخت گیر اور غریبوں کو اپنی رعایا سمجھنے والے انسان تھے۔ انسان ان کی نظروں میں محض زمین پر رینگنے والے کیڑوں کے برابر تھے۔ سبحان شاہ اور فیضان شاہ ہو بہو باپ کی کاپی تھے۔ احسان شاہ باہر سے پڑھ کر آئے تھے اس لئے ان کی شخصیت میں اس درجہ کرختگی نہ تھی۔ غریبوں کا درد کسی حد تک ان میں موجود تھا۔ ان کی یہی خوبی شفاعت شاہ اور بڑے دونوں بھائیوں کی نظر میں بری طرح کھٹکتی تھی۔ سب سے چھوٹے ہونے کی بنا پر احسان شاہ کچھ لاڈلے اور ضدی بھی واقع ہوئے تھے۔ ماں کی تو جیسے جان بندھی تھی ان میں۔ سبحان شاہ کی شادی خالہ زاد شہر بانو سے ہوئی تھی۔ شہر بانو حد سے زیادہ نک چڑھی اور اکھڑ مزاج خاتون تھیں۔ حاکمیت ان کی فطرت میں رچ بس گئی تھی۔ فیضان شاہ کی بیوی شہر بانو کی چھوٹی بہن مہر بانو تھیں مگر پہلے بچے کی پیدائش کے بعد وہ جانبر نہ ہو سکیں۔ فیضان شاہ کو مہر بانو سے محبت تھی جبھی ہر دم ان کی یاد میں افسردہ دکھائی دیتے' ماں' باپ بیٹے کی طرف سے پریشان تھے' اس نے تو اپنے بیٹے کو بھی نظر بھر کر نہیں دیکھا تھا۔ انہی دنوں شفاعت شاہ نے انہیں تبدیلی آب و ہوا کے لئے شمالی علاقہ جات کی طرف بھیج دیا۔ دو ماہ بعد جب وہ واپس آئے تو تنہا نہیں تھے۔ زرینہ ان کے ہمراہ تھیں جن سے وہ باقاعدہ نکاح کر چکے تھے۔ زرینہ شروع سے ہی کچھ باغیانہ فطرت کی تھیں۔ فیضان شاہ پہلی نظر میں ان کے بے پناہ حسن کا شکار ہوئے تو زرینہ بھی فیضان شاہ جیسے خوبرو' کڑیل جوان کے سامنے دل ہار بیٹھیں۔ چند ملاقاتیں دونوں کو قریب لے آئیں۔ زرینہ کے باپ اور بھائی کو پتا چلا تو ان کی فطرت غیرت نے جوش مارا مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی عملی قدم اٹھاتے' زرینہ نے فیضان شاہ کے ساتھ گھر سے بھاگ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ زرینہ کے گھر والوں نے ان دونوں کو بہتیرا تلاش کیا مگر وہ لوگ ان کی دسترس سے دور جا چکے تھے۔ بیٹے کی خوشی کو دیکھتے ہوئے شفاعت شاہ اور باقی گھر والوں نے مارے باندھے زرینہ کو بہو تسلیم تو کر لیا مگر انہیں کبھی وہ مقام نہ مل سکا جو شہر بانو یا مہر بانو کا تھا۔ شہر بانو اکثر باتوں باتوں میں یہ جتانا ہرگز نہ بھولتی تھیں کہ زرینہ گھر سے بھاگ کر آئی تھی۔ رفتہ رفتہ فیضان شاہ کی آنکھوں پر بندھی محبت کی پٹی اترنے لگی' وہ شہر بانو کی ہر بات پر آمنا صدقنا کہنے کے عادی تھے۔ شفاعت شاہ اور ماں کے انتقال کے بعد سارا نظام خود بخود سبحان شاہ اور شہر بانو کے ہاتھ میں آ گیا۔ زرمین کو سبحان شاہ اور فیضان شاہ کا یہ آمرانہ روپ دیکھ کر سخت دھچکا لگا تھا۔ سوئے اتفاق کہ وہ ماں ہی نہ بن سکیں۔ مہر بانو کے بیٹے کو سگی اولاد کی طرح پالا۔ شہر بانو کے تین بیٹے تھے جس پر وہ اترایا کرتی تھیں۔ احسان شاہ نے بھی بڑے بھائی کی دیکھا دیکھی اپنی کلاس فیلو سمیرا سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ سمیرا کا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔ باپ سرکاری ادارے میں گریڈ سولہ کا افسر تھا۔ سبحان شاہ اور شہر بانو نے صاف انکار کر دیا کہ وہ اپنے معیار سے کمتر لوگوں کے ہاں رشتہ لے کر نہیں جائیں گے۔ فیضان شاہ تو ویسے بھی ہر بات میں بڑے بھائی کا ساتھ دیا کرتے تھے۔ احسان شاہ بھی ضد کے پکے نکلے۔ بھائی کو جائیداد سے بے دخل کرنے کی دھمکی بھی کارگر ثابت نہ ہوئی کہ شفاعت شاہ اپنی زندگی میں ہی جائیداد کے تین حصے کر کے تینوں بیٹوں کے نام کر چکے تھے۔ مجبوراً سبحان شاہ کو احسان شاہ کی بات ماننا پڑی مگر نکاح بے حد سادگی سے انجام پایا اور یوں سمیرا دلہن بن کر حویلی میں آ گئیں۔ زرینہ سے انکی گاڑھی چھننے لگی تھی۔ جس پر شہر بانو کو خاصا اعتراض تھا۔ سمیرا نے شادی کے تین برس بعد بے حد پیاری سی بیٹی کو جنم دیا۔ زرینہ کی خواہش پر اس کا نام میرب رکھا گیا۔ میرب بے حد پیاری بچی تھی۔ ذہانت سے چمکتی آنکھیں اس کی خوبصورتی کو مزید نکھار دیتی تھیں۔ ماں سے زیادہ وہ زرینہ کے قریب تھی۔ مہر بانو کا بیٹا شہر بانو کی وجہ سے کبھی زرینہ کے قریب ہی نہ آ سکا تھا۔ اس کے ذہن میں بچپن سے ہی شہر بانو نے یہ بات بٹھا دی تھی کہ زرینہ اس کی سوتیلی ماں ہے جو کبھی اس کے ساتھ مخلص نہیں ہو سکتی۔ زرینہ میرب کو پیار کر کے ہی اپنی پیاسی مامتا کو سیراب کرنے کی کوشش کرتی تھیں۔ میرب کو بھی چھوٹی تائی سے بے حد لگاؤ تھا۔ احسان شاہ اور سمیرا میرب کے معاملے میں بے حد حساس تھے۔ میرب کے بعد سمیرا نے یکے بعد دیگرے دو بیٹوں کو جنم دیا مگر دونوں ہی بچپن میں فوت ہو گئے۔ اس کے بعد سمیرا کبھی دوبارہ ماں ہی نہ بن سکیں۔ میرب کو پڑھنے لکھنے کا شوق تھا' احسان شاہ بھی بیٹی کو اعلیٰ تعلیم دلوانا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے شہر میں شفٹ ہونے کا ارادہ کر لیا۔ سبحان شاہ اور فیضان

شاہ نے احسان شاہ کے اس فیصلے پر سخت اعتراض کیا تھا۔
''احسان شاہ! ہمارے خاندان کی لڑکیاں گھروں سے باہر نہیں جایا کرتیں۔'' سبحان شاہ کا لہجہ دوٹوک تھا۔
''اداٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' فیضان شاہ نے بھی بڑے بھائی کی حمایت کی۔
''میرب میری بیٹی ہے اور اس کی زندگی کا ہر فیصلہ کرنے کا مجھے حق حاصل ہے۔'' احسان شاہ جی کڑا کر کے بول اٹھے۔
''احسان شاہ! تم شاید بھول رہے ہو کہ تم کس سے مخاطب ہو۔'' سبحان شاہ گرجے تھے۔ ''تم ہمیشہ سے اپنی من مانی کرتے آئے ہو' پہلے ایک دو ٹکے کی لڑکی کو اس خاندان کی بہو بنایا اور اب بیٹی کو اسکولوں' کالجوں میں بھیج کر خاندان کی عزت کو ملیامیٹ کرنا چاہتے ہو۔'' فیضان شاہ کے کہنے پر احسان شاہ نے تڑپ کر دیکھا تھا۔
''ادا' آپ میرا منہ نہ کھلوائیں ورنہ میں گستاخ کہلاؤں گا۔ آپ نے بھی تو کسی کی بیٹی کو بھگا کر......''
''بس احسان شاہ! اس سے آگے ایک لفظ مت کہنا۔''
احسان شاہ کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے سبحان شاہ بول اٹھے تھے۔
''میں اپنی بیٹی کو اعلیٰ تعلیم ضرور دلواؤں گا۔'' احسان شاہ کا ازلی ضدی انداز عود کر آیا۔
''تو یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟'' سبحان شاہ مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے انہیں گھور رہے تھے۔
''سو فیصد۔''
''تو پھر ٹھیک ہے آج کے بعد تم ہمارے لئے مر گئے اور ہم تمہارے لئے۔ اس حویلی کی دہلیز پر دوبارہ قدم نہ رکھنا۔'' سبحان شاہ کے کہنے پر ایک لمحے کو احسان شاہ چپ سے رہ گئے تھے۔
''ٹھیک ہے' جیسے آپ کی مرضی' مگر مجھے یہاں آنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ کیونکہ یہ گھر جتنا آپ کا ہے' اتنا ہی میرا بھی ہے۔'' احسان شاہ یہ کہہ کر وہاں سے چلے گئے۔ جبکہ دونوں بڑے بھائی اپنی اپنی جگہ بل کھا کر رہ گئے۔
احسان شاہ کراچی میں شفٹ ہو گئے تھے۔ میرب نے کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ وہ شہر آ کر بہت خوش تھی۔ احسان شاہ سال میں دو تین بار گاؤں کا چکر ضرور لگاتے تھے۔ اپنی زمینوں وغیرہ کا حساب انہوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ میرب انگریزی ادب میں ماسٹرز کر رہی تھی۔
اس روز وہ ڈرائیور کے انتظار میں کھڑی تھی جب سیاہ ہونڈا سوک اس کے قریب آ کر رکی تھی۔
''آؤ' میں تمہیں گھر چھوڑ دیتا ہوں۔'' اس قدر بے تکلف لہجے اور انداز پر وہ حیران ہوئی تھی۔ وہ شخص اس کے لئے قطعاً اجنبی تھا۔ میرب رخ موڑ کر ذرا دور ہو گئی۔ اس کی متلاشی نگاہیں جامعہ کے گیٹ سے داخل ہوتی گاڑیوں پر تھیں۔ وہ اکثر خود ڈرائیو کیا کرتی تھی مگر جانے کس خدشے کے تحت بابا جان (احسان شاہ) اسے اکیلے کہیں بھی آنے جانے سے منع کرتے تھے۔
''کم آن...... میں کوئی غیر تو نہیں ہوں جو تم اس طرح بی ہیو کر رہی ہو۔'' وہ گاڑی سے اتر کر اس کے مقابل آن کھڑا ہوا۔
''آپ کی تعریف؟'' میرب نے تیورا کر پوچھا تھا۔
''وہ تو سارا زمانہ کرتا ہے۔'' گھنی مونچھوں کو انگلی سے سنوارتے ہوئے بولا۔ میرب کو اس کی نظروں سے الجھن سی ہونے لگی تھی۔
''شٹ اپ مسٹر' میں ویسی لڑکی نہیں ہوں جیسی آپ مجھے سمجھ رہے ہیں۔ جائیے' کہیں اور ٹرائی کیجئے۔'' دل ہی دل میں ڈرائیور کے جلدی آنے کی دعا کرتی' وہ اس شخص سے سخت الجھن محسوس کر رہی تھی۔ جواب میں اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا تھا۔
''آپ کے خیال میں کیسی لڑکی ہیں آپ؟'' وہ محظوظ ہوا تھا۔ تبھی میرب کو دور سے اپنی گاڑی آتی دکھائی دی تو وہ فوراً آگے بڑھ گئی۔
''کہاں مر گئے تھے اتنی دیر سے انتظار کر رہی تھی۔'' اس شخص کا غصہ بیچارے ڈرائیور پر اتارا تھا۔ سارا راستہ اسی کھولن میں گزر گیا تھا۔
''ہیلو کیسی ہیں آپ؟'' سفید کلف لگے کڑکڑاتے کرتا شلوار میں ملبوس وہ اس کے سامنے تھا۔ میرب کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ جانے کون

تھااور یوں ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ وہ جہاں جاتی' وہاں موجود ہوتا' یونیورسٹی میں آزادانہ گھومنا پھرنا میرب کے لئے دوبھر ہوگیا تھا۔

''آپ آخر چاہتے کیا ہیں؟'' وہ زچ ہو کر بولی تھی۔

''آپ سے دوستی۔'' گہری مخمور نگاہیں میرب کے صبیح چہرے پر ٹکی تھیں۔

''آپ کا دماغ تو درست ہے۔'' وہ تقریباً غرائی تھی۔

''دوستی کرنا غلط بات تو نہیں ہے۔''

''مگر مجھے آپ جیسوں سے دوستی کرنا ہرگز پسند نہیں ہے۔'' وہ چبا چبا کر بولتی آگے بڑھنے لگی تو وہ راہ میں حائل ہوگیا۔

''مجھ جیسوں سے کیا مراد ہے تمہاری؟''

''آپ فضول میں اپنا اور میرا وقت ضائع کر رہے ہیں۔''

''تمہیں اعتراض کس بات پر ہے دوستی پر یا ''مجھ'' سے دوستی پر۔'' وہ سنجیدہ سے لہجے میں گویا ہوا تھا۔

''دونوں باتوں پر۔'' وہ تنک کر بولی۔

''اور اگر میں کہوں مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے تو؟'' اس کی بات پر ایک لمحے کو وہ چپ سی رہ گئی۔ بالکل انجان اور اجنبی سا شخص' جو خواہ مخواہ ہی اس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ اب نیا شوشا چھوڑ رہا تھا محبت کا۔ میرب کا حلق تک کڑوا ہونے لگا۔ یہ شخص جو بظاہر دیکھنے میں تو اچھا خاصا خوش شکل تھا مگر اس کا انداز' لب و لہجہ اور مستزاد بے تکلفی نے میرب کو اس سے سخت کبیدہ خاطر کر دیا تھا۔

''کہاں کھو گئیں محترمہ؟'' اس کے چٹکی بجانے پر وہ چونکی تھی۔ پھر ایک تیز نظر اس پر ڈالی۔

''میں یہاں پڑھنے آتی ہوں۔ اپنے لئے محبتیں تلاش کرنے نہیں۔'' نخوت سے کہتی وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ اپنے لئے دیئے رہنے والی طبیعت کی وجہ سے اس نے کسی سے کبھی خاص دوستیاں نہیں پالی تھیں۔ احسان شاہ کو بیٹی کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کا شوق ضرور تھا' مگر اپنے خاندان کی روایات اور حدود و قیود بھی اسے اچھی طرح باور کروادی تھیں۔ اس شخص کی وجہ سے وہ آج کل خاصی پریشان تھی۔ یونیورسٹی میں اس کا یوں آگے پیچھے پھرنا' راستہ روکنا' بہت سے افسانوں کو جنم دے سکتا تھا اور وہ کم از کم اپنی نیک نامی پر حرف نہیں آنے دینا چاہتی تھی اور اگر بابا سائیں کو اس سارے معاملے کی بھنک بھی پڑ گئی تو کیا ہوگا؟ یہ ان کا اعتماد اور محبت ہی تو تھی جس کی بنا پر وہ اپنے سارے خاندان سے کٹ کر بیٹھے تھے۔ اس نے سوچ لیا تھا' اگر چند روز تک یہی سلسلہ رہا تو وہ بابا سائیں سے کھل کر بات کرے گی۔ مگر ایسی نوبت ہی نہ آئی' اگلے چند دن حیرت انگیز طور پر سکون سے گزر گئے۔

''ہونہہ! ہوگا کوئی بگڑا رئیس زادہ جو چند دن کے لئے دل بہلانے یونیورسٹی چلا آیا تھا۔''

مگر یہ اس کی خام خیالی تھی۔ چوتھے دن وہ پھر سے موجود تھا۔

''کیسی ہو؟'' ڈارک گلاسز کے عقب سے جھانکتی وارفتہ نگاہیں میرب کے دلکش چہرے پر جمی تھیں۔

''آ......آپ؟'' اسے یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر وہ بوکھلا گئی۔

''مجھے دیکھ کر اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو؟'' اس کی کیفیت سے وہ محظوظ ہوا تھا۔ ''تم نے سوچا ہوگا میں کسی حادثے کا شکار ہوگیا ہوں گا۔ میرب احسان اتنی آسانی سے میں تمہارا پیچھا چھوڑنے والا نہیں ہوں۔''

''تم آخر کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہو؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں بے بسی در آئی تھی۔

''چچ......چچ......اتنی بے بسی' مجھے خواہ مخواہ تم پر ترس آنے لگا ہے۔''

''بھاڑ میں جاؤ تم۔'' وہ غصے سے پیر پٹختی آگے بڑھنے لگی تو وہ راہ میں حائل ہوگیا۔

''میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' اس کی بات پر میرب کو ایک اور دھچکا لگا تھا۔ عجیب شخص تھا۔ نہ جان نہ پہچان' خواہ مخواہ کمبل ہو

رہا تھا۔ پہلے محبت' اب شادی کی پیشکش' وہ سچ مچ چکرا کر رہ گئی تھی۔

''مجھے ہر صورت تمہارا جواب ''ہاں'' میں چاہیے۔ بہت جلد میں تمہارے والد بزرگوار سے بھی ملوں گا۔'' میرب کے اردگرد گویا دھماکے سے ہونے لگے تھے۔ وہ اس کی نظروں کے سامنے اپنی گاڑی میں بیٹھ کر جا چکا تھا اور وہ ساکت سی وہاں کھڑی رہ گئی تھی۔

❀❀❀

اگلے چند روز عجیب سی کشمکش میں گزر گئے تھے۔ وہ سخت پریشان تھی۔ آخر اس نے سب کچھ ماں کو بتانے کا فیصلہ کر لیا۔ دو دن سے وہ یونیورسٹی بھی نہیں گئی تھی۔ ہر آہٹ پر وہ چونک جاتی۔ ڈور بیل بجنے پر یا کسی اجنبی کی آمد کی اطلاع پر وہ سہم سی جاتی۔ اب اس ٹینشن سے بچنے کا واحد حل یہی تھا کہ وہ سب کچھ مما کو بتا دیتی۔ وہ نیچے آئی تو مما اور بابا سائیں دونوں لاؤنج میں موجود تھے۔ دھچکا تو تب لگا جب اس کی نظر وہاں موجود تیسرے فرد پر پڑی۔ اس کا دل ڈوبنے لگا تھا۔

''میرب آؤ بیٹا' رک کیوں گئیں۔'' بابا سائیں کی آواز پر وہ مرے مرے قدم اٹھاتی وہاں تک پہنچی۔

''یہاں بیٹھو' میرے پاس۔'' بابا سائیں نے اپنے قریب صوفے پر اس کے لئے جگہ بنائی۔ میرب نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھا کر دیکھا۔ اس کے لبوں پر بڑی شاطرانہ سی مسکراہٹ تھی۔

''ان سے ملو' یہ مہران شاہ ہے' تمہارے بڑے تایا جان کا منجھلا بیٹا۔'' بابا سائیں کے تعارف کروانے پر میرب نے ایک جھٹکے سے جھکا ہوا سر اٹھایا تھا۔ مہر بھی تمہاری یونیورسٹی میں ہی پڑھتا ہے۔'' میرب نے دیکھا اس کے لبوں پر ایک خاص سا تبسم تھا۔

''ایکسکیوز می۔'' وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔

''اسے کیا ہوا؟'' احسان شاہ حیران ہوئے تھے۔

''شاید اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں دیکھتی ہوں۔'' سمیرا اپنی شال سنبھالتی اٹھ کر چلی گئیں۔

''کیا ہوا میرب؟ یہ کیا حرکت کی تم نے؟''

''مما! یہ لفنگا ہمارے گھر کیوں آیا ہے؟'' وہ سخت طیش میں تھی۔

''کون لفنگا؟ مہران شاہ؟ مگر تم کیسے جانتی ہو اسے؟''

''میں آپ کو یہی بتانے آ رہی تھی مگر مجھے نہیں پتا تھا وہ پہلے سے وہاں موجود ہوگا۔''

''میرب! آخر بات کیا ہے؟ کھل کر بتاؤ۔'' اور تب میرب نے ایک ایک بات سمیرا بیگم کو بتا دی۔ یہ سب سن کر وہ بھی کچھ متفکر سی نظر آنے لگی تھیں۔

''مما...... بابا سائیں سے کہیں جلد از جلد اس شخص کو یہاں سے چلتا کریں۔''

''کیسے کہہ دوں؟ تمہارے بابا کا بھتیجا ہے وہ۔ اتنے عرصے بعد خاندان کا کوئی فرد ان سے ملنے آیا ہے۔ ان کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔''

''اتنے برسوں بعد ان لوگوں کو اب ہماری یاد کیسے آ گئی؟''

''ہو سکتا ہے یونہی ملنے چلا آیا ہو۔'' سمیرا بیگم نے قیاس آرائی کی۔

''اور وہ شادی کی آفر! اگر اس نے بابا سائیں سے کچھ کہہ دیا تو؟''

''اللہ مالک ہے۔ تم پریشان نہ ہو۔'' اس کا گال تھپتھپاتیں وہ اٹھ کر باہر چلی گئیں۔

''چاچا سائیں! بابا سائیں آپ سے بہت پیار کرتے ہیں اور اس بات کا ثبوت میری یہاں موجودگی ہے۔''

''اداسائیں ہمیشہ سے ہی سخت گیر رہے ہیں۔ ہو بہو بابا سائیں کی کاپی۔ ادا فیضان کیسے ہیں؟ ان کا بیٹا بھی تو اب کافی بڑا ہو گیا ہوگا۔'' احسان شاہ کے لہجے میں ان دیکھی سی پیاس تھی۔ اپنوں کی محبت رگوں میں لہو کی طرح دوڑ رہی تھی۔

''فیضان چاچا کا بیٹا پڑھنے کے لئے انگلینڈ گیا ہوا ہے۔ مجھ سے بڑے ادا کامران کی شادی بڑے ماموں کی بیٹی فیروزہ سے ہوئی ہے اور مجھ سے چھوٹا عدنان بھی پڑھنے کے لئے انگلینڈ گیا ہوا ہے۔ حسیب اور عدنان اکٹھے پڑھتے ہیں۔'' مہران نے خاصا مفصل جواب دیا تھا۔

''تم یہاں رہ کہاں رہے ہو؟''

''فی الحال تو یونیورسٹی کے ہاسٹل میں۔ کچھ دنوں میں اپنا فلیٹ لینے کا رادہ ہے۔''

''کیسی غیروں جیسی بات کرتے ہو۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ چچا کا گھر ہوتے ہوئے تم ہاسٹلوں میں دھکے کھاؤ۔'' احسان شاہ نے پیار بھری دھونس سے کہا تو مہران ہنس دیا۔

''یہ تو آپ کی محبت ہے چچا سائیں' میں یہاں آتا جاتا رہوں گا۔''

''ادا سائیں خفا ہوں گے تمہارے یہاں رہنے پر؟''

''میں فی الحال کچھ کہہ نہیں سکتا۔ بابا سائیں کے مزاج کو آپ مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں۔''

''ہاں......ٹھیک کہتے ہو۔'' احسان شاہ نے ایک گہری سانس لی۔

''میں اب چلتا ہوں۔'' مہران شاہ نے جانے کی اجازت چاہی۔

''ارے ایسے کیسے؟ کھانا کھائے بغیر تم یہاں سے نہیں جاسکتے۔ بھئی بیگم! کھانا وغیرہ لگوایئے اور میرب کو بھی بلوایئے۔'' احسان شاہ کب سے خاموش بیٹھی سمیرا بیگم کی طرف متوجہ ہوئے۔

''میں کھانا لگواتی ہوں۔ میرب ریسٹ کررہی ہے۔ اس کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔'' سمیرا بیگم اٹھ کر کچن کی جانب چل دیں۔

❁❁❁

''آؤ' میں تمہیں ڈراپ کردیتا ہوں۔'' وہ ڈرائیور کے انتظار میں کھڑی تھی جب مہران شاہ کی گاڑی اس کے قریب آکر رکی تھی۔ وہ سر جھٹک کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

''کم آن میرب......میں کوئی غیر تو نہیں۔ تمہارا سگا تایا زاد ہوں۔'' اس کا انداز مصالحانہ تھا۔

''ڈرائیور آنے والا ہوگا۔'' وہ بمشکل لہجے کی تلخی چھپا پائی تھی۔

''خواہ مخواہ نخرے مت کرو جبکہ تم جانتی ہو ہم کزنز ہیں۔'' مہران شاہ کا لہجہ جھنجلایا ہوا سا تھا۔ اردگرد کے لوگ متوجہ ہونے لگے تھے۔ وہ چپ چاپ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

''مجھے یہ سب پسند نہیں ہے۔ آئندہ احتیاط کیجئے گا۔'' بیٹھتے ہی اس نے سرد سے لہجے میں کہا تھا۔

''مجھے تو پسند ہے ناں۔'' مہران شاہ کا لہجہ زچ کرنے والا تھا۔

''میں آپ کی پسند ناپسند کی پابند نہیں ہوں۔'' وہ ناک چڑھا کر بولی۔

''نہیں ہو تو ہم پابند کرلیں گے۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے سویٹ ہارٹ۔'' وہ مسکرایا تو اس کے انداز اور طرز تخاطب پر میرب جی جان سے جل کررہ گئی۔ تھوڑی دور جاکر گاڑی رک گئی۔ میرب نے دیکھا وہ ایک شاندار سے ریسٹورنٹ کا پارکنگ لاٹ تھا۔

''گاڑی یہاں کیوں روکی ہے؟''

''ہم یہاں لنچ کریں گے۔''

''مجھے کوئی لنچ ونچ نہیں کرنا۔ گاڑی واپس موڑیں۔''

''مگر مجھے بہت سخت بھوک لگی ہے۔ کم آن......ضد مت کرو۔ چلو آؤ۔ شاباش۔'' وہ چمکار کر بولا تو میرب سے ضد کرنا مشکل ہوگیا۔

''آپ کو لنچ کرنا ہے تو شوق سے کیجئے۔ میں گھر چلی جاؤں گی۔'' وہ گاڑی سے نکل کر سڑک کی طرف بڑھی تو وہ اس کے سامنے آگیا۔

''بڑا غصہ اور اکڑ ہے محترمہ۔ آخر کس بات کا غرور ہے تمہیں؟'' وہ تیکھی نظروں سے اسے جانچتے ہوئے بولا۔
''مجھے اتنی بے تکلفی پسند نہیں ہے اور یہ جو آپ مجھ پر میرے تایازاد ہونے کا رعب جما رہے ہیں، مجھ پر کوئی خاص اثر نہیں ہونے والا۔ ساری زندگی میرے بابا کو خاندان سے الگ کر کے رکھا اور اب چلے آئے ہیں رشتہ داریاں نبھانے۔ آپ بابا کے بھتیجے ضرور ہیں مگر میرے کچھ نہیں۔ مجھے......'' وہ پیر پٹختی آگے بڑھی اور سامنے سے آتی ٹیکسی کو ہاتھ دے کر روکا۔ مہران شاہ محض دانت پیس کر رہ گیا۔

❀❀❀

''مما...... یہ...... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' وہ شاک کی کیفیت میں تھی۔
''یہ تمہارے بابا اور تایا جان کا فیصلہ ہے۔'' سمیرا بیگم کا لہجہ تھکا تھکا سا تھا۔
''بابا ایسا نہیں کر سکتے۔ میری زندگی کا اتنا اہم فیصلہ وہ بھی مجھ سے پوچھے بغیر کر دیا۔ نہیں مما...... آپ...... آپ بابا کو بتا دیں...... مجھے یہ رشتہ کسی قیمت پر منظور نہیں ہے۔'' وہ تو یہ سوچ سوچ کر ہی پاگل ہوئی جا رہی تھی کہ مہران شاہ جیسا شخص، جسے وہ سخت ناپسند کرتی تھی۔ اس کا مقدر بننے جا رہا تھا۔
''میں کوشش کر کے دیکھ چکی ہوں مگر تمہارے بابا کا فیصلہ اٹل ہے۔ وہ کہتے ہیں ایک بار پھر بڑے بھائیوں کو ناراض نہیں کر سکتے۔''
''مما...... مما پلیز۔ میں مر جاؤں گی۔ وہ روایتی سوچ رکھنے والا فیوڈل لارڈ کسی طرح بھی میرے ساتھ نہیں چل سکتا۔'' وہ روہانسی ہو گئی۔ سمیرا بیگم بے بسی سے محض سرد آہ بھر کر رہ گئیں۔
سبحان شاہ اور شہر بانو کی بالکل اچانک آمد نے احسان شاہ کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ سبحان شاہ نے جس بیقراری سے احسان شاہ کو گلے سے لگایا اور پیشانی چومی، احسان شاہ کو لگا برسوں کی تھکن اتر گئی ہو۔ شہر بانو بھی واری صدقے جا رہی تھیں۔
''اماں جی ٹھیک کہتی تھیں کہ پانی پر لاٹھی مار دینے سے پانی بٹ کر دو حصوں میں تقسیم نہیں ہو جاتا۔ خون کی کشش آخر ایک دوسرے کو قریب کھینچ ہی لاتی ہے۔'' سبحان شاہ کے لہجے کا کروفر، عاجزی و انکساری میں ڈھلا ہوا تھا۔
''جب سے مہران شاہ نے بتایا کہ وہ آپ لوگوں سے ملا ہے، ہمیں تو ایک پل کو چین نہیں آیا۔'' شہر بانو کا لہجہ صاف بناوٹی لگ رہا تھا۔ احسان شاہ تو بھائی بھاوج کے سامنے بچھے جا رہے تھے جبکہ سمیرا بیگم محض خاموش تماشائی بنی بیٹھی تھیں۔ ان کی چھٹی حس بار بار کسی گڑبڑ کا احساس دلا رہی تھی۔ سبحان شاہ اور شہر بانو کے چہروں پر نقاب چڑھے ہوئے محسوس ہو رہے تھے اور سمیرا بیگم کو ان نقابوں کے پیچھے چھپے لالچی اور حریص چہرے صاف نظر آنے لگے۔ جب شہر بانو نے پیار بھری دھونس سے مہران شاہ کے لئے میرب کا ہاتھ مانگا۔ سبحان شاہ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ میرب ان کی بیٹی ہے، اور وہ اس کی زندگی کا فیصلہ کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ احسان شاہ تو کچھ بول ہی نہ سکے جبکہ سمیرا بیگم جز بز ہو کر رہ گئیں۔ وہ لوگ منگنی کی تاریخ لے کر ہی اٹھے تھے۔
''یہ کیا کیا آپ نے؟ ایک بار میرب سے بھی پوچھ لیا ہوتا تو......''
''ہم میرب کے دشمن نہیں ہیں۔ مہران شاہ پڑھا لکھا، سلجھا ہوا لڑکا ہے۔''
''مگر......''
''آخر آپ کو اعتراض کس بات پر ہے؟'' احسان شاہ نے کڑے تیوروں سے پوچھا۔
''مجھے کیا اعتراض ہوگا۔ اچھا ہوتا اگر میرب کی مرضی بھی معلوم کر لی جاتی۔''
''وہ ہماری بیٹی ہے۔ ہمارے فیصلوں سے انکار کرنے کی جرات نہیں کر سکتی۔ برسوں بعد ہمیں خاندان سے دوبارہ جڑنے کا ایک موقع ملا ہے اور ہم یہ گنوانا نہیں چاہتے۔'' احسان شاہ کا لہجہ اٹل تھا۔
''اوہ، تو یوں کہیے ناں بیٹی کی قیمت پر خاندان حاصل کرنا چاہتے ہیں۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی سمیرا بیگم کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔
''یہ کیا کہہ رہی ہو تم سمیرا بیگم، مہران شاہ ہر لحاظ سے میرب کے ہم پلہ ہے۔ ہمارا سب کچھ میرب کا ہے۔ کل کو کوئی غیر اس پر تسلط

جمائے' کیا اس سے اچھا نہیں کہ ہمارا اپنا خون' ہمارا داماد بنے۔'' احسان شاہ کے دلائل کے سامنے سمیرا بیگم بے بس سی نظر آنے لگی تھیں اور اب میرب کا جو ردعمل سامنے آیا تھا' اس پر وہ ازحد پریشان تھیں' مگران کی پریشانی' میرب کا واویلا کچھ بھی کام نہ آیا' چند روز بعد سبحان شاہ' شہر بانو' فیضان شاہ' زرینہ اور گھر کے باقی افراد مٹھائی' پھلوں' پھولوں' زیورات اور کامدار سوٹوں سے لدے پھندے' احسان ولا آن پہنچے تھے۔ فی الحال منگنی کی رسم ادا کی گئی اور شادی چھ ماہ بعد میرب کے فائنل سمسٹر کے بعد طے پائی۔ میرب بے جان ہوتے وجود کے ساتھ سب کے درمیان بیٹھی تھی۔ وہ ٹکر ٹکر ایک ایک کے چہرے کو دیکھتی اور پھر نظریں جھکا لیتی۔ قسمت کی اس ستم ظریفی پر اس کا رواں رواں شکوہ کناں تھا۔

''میرے ساتھ چلو۔'' وہ اپنی کلاس کی طرف جا رہی تھی جب مہران شاہ چلا آیا۔

''کہاں؟''

''جہاں میرا دل چاہے گا۔'' وہ گہری نگاہوں سے اس کے دلکش چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ میرب کلس کر رہ گئی۔

''میری کلاس ہے۔'' اس نے بودا سا بہانہ بنایا تو مہران قہقہہ لگائے بنا نہ رہ سکا۔

''کلاس سے زیادہ تمہارے لئے میری بات کی اہمیت ہونی چاہئے۔ آخر میں تمہارا ہونے والا شوہر ہوں۔'' وہ مونچھوں کو انگلی سے سنوارتے ہوئے بولا۔ میرب نے چڑ کر نظروں کا زاویہ بدلا۔ ''جلدی آؤ' میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' تحکم بھرے لہجے میں کہتا وہ آگے بڑھ گیا تو ناچار میرب کو اس کی تقلید کرنا پڑی۔

''جانتی ہو یہ وہی ریسٹورنٹ ہے جہاں ایک بار تم نے مجھے بری طرح دھتکار دیا تھا۔'' گاڑی پارک کرتے ہوئے وہ بولا۔ میرب چپ چاپ اپنے ہاتھوں کو گھورے گئی۔ جب سے یہ رشتہ جڑا تھا' میرب کو گویا ایک نامعلوم سی چپ لگ گئی تھی۔ ہنستی بولتی تھی نہ غصہ کرتی تھی۔ ایک گہرا سناٹا تھا جو اس کے اندر تک اتر گیا تھا۔

''وقت' وقت کی بات ہے۔ بڑا غرور تھا ناں تمہیں خود پر۔ دیکھا کیسا پابند کیا ہے میں نے تم کو۔'' وہ بڑے فخریہ انداز میں بولا تھا۔ ''اچھا بولو کیا کھاؤ گی؟'' مینو کارڈ پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' وہ ناگواری سے بولی تھی۔

''مگر مجھے تو ہے۔'' وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ پھر خود ہی اپنی مرضی سے آرڈر نوٹ کروایا۔

''کیا تم اس منگنی سے خوش نہیں ہو؟'' بظاہر بڑے بھولپن سے پوچھا گیا تھا۔

''یہ سراسر بابا کا فیصلہ ہے۔ میرے خوش ہونے یا نہ ہونے سے کسی کو کیا فرق پڑتا ہے۔'' وہ چیخ کر رہ گئی۔

''چچ......چچ......اتنی بے بسی' وہ بھی میرب احسان کے لہجے میں۔'' وہ اسے زچ کرنے لگا تھا۔

''ہیلو مہران! ہاؤ آر یو؟ کہاں غائب ہو اتنے عرصے سے؟'' اسی پل دلکش نسوانی آواز قریب ہی سے ابھری تھی۔ دونوں نے چونک کر دیکھا تھا۔ بلیک جینز اور ملٹی کلرز کی سلیولیس ٹاپ اور کھلے بالوں میں وہ خاصی دلکش' الٹرا ماڈرن سی لڑکی تھی۔

''ہیلو ماریہ! تم یہاں کیسے؟'' خوشدلی سے کہتے ہوئے باقاعدہ معانقہ کیا گیا۔ بے حیائی کے اس نظارے پر میرب محض نظریں جھکا کر رہ گئی۔ وہ دونوں باتیں کر رہے تھے جبکہ میرب کے اردگرد گہرے سناٹے چھا رہے تھے۔ مہران نے اس کا تعارف کروایا نہ ہی ماریہ نے اس پر کوئی خاص توجہ کی۔

''میری بہت پرانی فرینڈ ہے۔ دو سال قبل لندن چلی گئی تھی۔ ماریہ کو رخصت کرنے کے بعد وہ میرب سے مخاطب ہوا۔ میرب کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کھانا سرو کیا جا چکا تھا۔ وہ بے دلی سے تھوڑے سے چاول پلیٹ میں ڈالے ٹونگ رہی تھی۔ کھانے کے دوران مہران شاہ کے سیل پر ماریہ جیسی دو تین فرینڈز کی کالز آئیں جنہیں وہ خاصی خوشدلی سے ریسیو کر رہا تھا۔ گویا اسے میرب کے ردعمل سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ شاید وہ جانتا تھا کہ میرب احسان اب کچھ نہیں کر سکتی۔ میرب نے آنکھوں میں امڈ آنے والے آنسوؤں کو بمشکل پیچھے دھکیلا

تھا۔ اپنی قسمت پر تو وہ خود بھی حیران تھی۔

❀❀❀

وقت نے ایسا پلٹا کھایا کہ وہ انگشت بدنداں رہ گئی۔ قیامت سے پہلے قیامت آ چکی تھی۔ کم از کم میرب احسان کے لئے تو وہ روز محشر تھا۔ جب وہ یونیورسٹی سے لوٹی تو گھر کے سامنے لوگوں کے ہجوم کو دیکھ کر دل دہل سا گیا اور پھر جو منظر اس کی آنکھوں نے دیکھا' وہ تو گویا پتھرا کر رہ گئی۔ مما اور بابا کے خون میں لت پت وجود دیکھ کر وہ وہیں ڈھے گئی تھی۔ اسے نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا۔ دو دن بعد وہ ہوش میں آئی تو سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ اس کے جان سے پیارے ماں باپ منوں مٹی تلے جا سوئے تھے۔ وہ اتنا تڑپ تڑپ کر روئی تھی کہ پتھروں کے دل بھی گداز ہوا تھے۔ شہر بانو' فیروزہ بھابی' زرینہ تائی سب ہی اس کی دلجوئی کرتے' ایک مشہور و معروف شاپنگ مال میں ہونے والے خودکش دھماکے نے اس کے مما اور بابا کی جان لے لی تھی۔ کل تک اخباروں اور ٹی وی چینلز پر ایسے کتنے ہی بے گناہوں کو خودکش دھماکوں اور دہشت گردی کا شکار ہوتے ہوئے دیکھا کرتی تھی کبھی یہ نہ سوچا تھا کہ ایسا کڑا وقت خود اس پر بھی آ سکتا ہے؟ معصوم اور بے گناہ شہریوں کی جان لینے والے' مذہب کے نام پر کھلی دہشت گردی کر رہے تھے۔ اسلام تو امن و سلامتی کا مذہب ہے۔ اسلام میں تو کسی غیر مسلم تک کو بے گناہ قتل کرنے کی اجازت نہیں ہے پھر یہ تو اپنے ہی مسلمان بھائیوں کا خون کر رہے تھے۔

سبحان شاہ میرب کو اپنے ساتھ لے کر حویلی چلے گئے تھے۔ میرب تو گویا پتھر کی ہو چکی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ بہلنے لگی۔ زرینہ تائی اس کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ فیضان شاہ کے بیٹے حسیب نے تو کبھی اسے ماں سمجھا ہی نہیں۔ میرب کو وہ بالکل سگی بیٹیوں کی طرح چاہنے لگی تھیں۔ تھوڑا وقت اور گزرا تو میرب کو اپنی نامکمل تعلیم مکمل کرنے کا خیال آیا۔ مگر وہ اس وقت گنگ رہ گئی جب سبحان شاہ نے دوٹوک انداز میں منع کر دیا۔

''جتنا پڑھنا تھا' پڑھ لیا' اب آرام سے گھر میں بیٹھو۔''

''مگر تایا جان......''

''بس......ہم اپنی بات صرف ایک بار کہنے کے عادی ہیں۔'' پیار نچھاور کرنے والے تایا کا تو روپ ہی بدلا ہوا تھا۔ گھر کے سب لوگوں کا رویہ بدل گیا تھا۔ صرف ایک زرینہ تائی تھیں جو اس سے بے پناہ پیار کرتی تھیں۔ میرب کو ان کا مہربان وجود بھی غنیمت لگا کرتا تھا۔ کبھی سوچتی اگر تائی زرینہ بھی نہ ہوتیں تو وہ اس عقوبت خانے میں پاگل ہو جاتی۔ مہران شاہ مہینے میں ایک آدھ بار حویلی آتا مگر اب وہ میرب کے وجود سے یکسر بے نیاز ہو چکا تھا۔ یہاں آ کر ہی مہرب کو پتا چلا تھا کہ مہران شاہ پہلے سے شادی شدہ تھا۔ پہلی بیوی شادی کے چند ماہ بعد ہی چل بسی تھی۔ اس کی موت خاصی پراسرار تھی۔ رات کو اچھی بھلی سوئی مگر صبح جاگ نہ سکی۔ دبے دبے لفظوں میں یہی کہا جاتا تھا اسے زہر دیا گیا تھا۔ مگر کھل کر بولنے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔

میرب تو خاصی سراسیمہ تھی۔ اسے اب سمجھ میں آیا تھا کہ سبحان شاہ کو اتنے عرصے بعد چھوٹے بھائی کی یاد کیوں ستانے لگی تھی۔ میرب ساری جائیداد کی تنہا وارث تھی۔ مہران شاہ سے شادی کے بعد وہ سب کچھ ہتھیانے کے چکر میں تھے۔ انہی دنوں گھر میں میرب اور مہران کی شادی کا تذکرہ ہونے لگا۔

''میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔'' وہ صاف انکار کرتے کرتے رہ گئی۔

''مگر کیوں؟'' شہر بانو نے تیوری چڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''ابھی میں ذہنی طور پر اس کے لئے تیار نہیں ہوں۔ اور......پھر مما اور بابا کو گزرے ہوئے محض تین ماہ ہی تو ہوئے ہیں۔'' اس کی آواز رندھ گئی۔

''شادی ہو جائے گی تو خود بخود ذہن اسے قبول کر لے گا۔'' شہر بانو نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔

''پلیز تائی ماں! کچھ عرصہ اور رک جائیں۔'' اس نے اتنی لجاجت سے کہا کہ پتھر دل شہر بانو بھی خاموش ہو گئیں۔ شادی کی بات کچھ

عرصے کے لئے دب گئی تو میرب نے سکھ کا سانس لیا۔ مہران شاہ اسے کسی طور قبول نہ تھا اس کا ذہن اب تیزی سے کچھ اور سوچنے لگا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی مگر یہ سب اتنا آسان نہ تھا۔ اس کے اردگرد کڑا پہرہ رہتا تھا۔ وہ اپنی مرضی سے کہیں آجا نہیں سکتی تھی۔ اس کے ننھیال میں فقط ایک ماموں تھے جو دبئی میں مقیم تھے۔ گزشتہ پانچ برس سے وہ پاکستان نہیں آئے تھے۔ بس فون پر دعا سلام ہو جاتی تھی۔ ان کا کانٹیکٹ نمبر اس کے حافظے میں محفوظ تھا۔ یہ تو وہ اچھی طرح جان گئی تھی کہ تایا اور تائی کی نظر اس کی جائیداد پر تھی۔

''شادی تو ظاہر ہے تمہاری مہران شاہ سے ہی ہوگی مگر کبھی بھی اپنی جائیداد اس کے نام کرنے کی غلطی نہ کرنا' بے مایہ ہو جاؤ گی تو ان کی نظروں میں بالکل کوئی حیثیت نہیں رہے گی تمہاری۔'' ایک روز زرینہ تائی نے چپکے سے اسے کہا تھا۔

''تائی جان! میں...... میں مہران شاہ سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔'' وہ ذرا سی ہمدردی پا کر سسک اٹھی تھی۔ زرینہ نے سراسیمہ ہو کر دروازے کی طرف دیکھا۔ لپک کر دروازہ بند کیا۔

''ششش...... آہستہ بولو۔ یہاں دیواروں کے بھی کان ہیں۔ کسی نے سن لیا تو قیامت آ جائے گی۔''

''زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا' مجھے جان سے مار ڈالیں گے۔ تو مار ڈالیں' مما پاپا کے بعد تو یوں بھی زندگی بوجھ لگنے لگی ہے۔''

''اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے میری جان۔'' زرینہ نے اسے گلے سے لگا لیا تھا۔

''تائی جان! مہران شاہ سے شدید نفرت کرتی ہوں میں۔ پھر بھلا کیسے اسے شوہر کے طور پر قبول کرلوں۔''

''بعض اوقات انسان کو تقدیر کے آگے سرنگوں ہونا پڑتا ہے۔ مجھے دیکھو...... میرے جیسی بدبخت ہوگی بھلا جس نے اپنے ہاتھوں سے اپنی دنیا اجاڑ ڈالی۔ اپنی سطحی خواہشات کی تکمیل کی خاطر اپنے پیاروں کی عزت کو خاک میں ملا ڈالا اور اپنے پیاروں کا دل دکھانے کی سزا یہ ہے کہ میں برسوں سے اس جہنم میں جل رہی ہوں۔'' زرینہ کا لہجہ کھویا کھویا سا تھا۔ میرب اپنا دکھ بھول کر ان کے چہرے کی طرف بغور دیکھنے لگی تھی۔

''مگر...... میں نے تو سنا تھا فیضان تایا سے آپ کی لو میرج تھی۔''

''ہاں...... مگر وہ پیار بھی چند روزہ تھا۔ بعد میں تو صرف سمجھوتہ رہ گیا۔ گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کی کوئی عزت نہیں ہوتی' شک کے زہریلے ناگ تاعمر اسے ڈستے رہتے ہیں۔ یہ مرد بڑے عجیب ہوتے ہیں' محبت کے جھانسے میں لینے کے بعد خود ہی بغاوت کی ترغیب دیتے ہیں اور باقی کی ساری زندگی شک کی نذر کر دیتے ہیں۔ ماں باپ' بھائیوں کی عزت کو مٹی میں روند کر آنے والی لڑکی کی حیثیت سسرال میں دو کوڑی کی بھی نہیں ہوتی۔ فیضان نے مجھ پر کبھی اعتماد نہیں کیا۔ وہ کہتے ہیں جو لڑکی اپنے سگے ماں باپ کی عزت اچھال سکتی ہے وہ کل کو کسی اور کی خاطر مجھے بھی تو چھوڑ کر جا سکتی ہے۔'' اور شاید وہ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ گھر سے ایک بار قدم باہر نکل آئے تو سات سمندروں کا پانی بھی دامن اجلا نہیں کر سکتا۔ گھر سے بھاگی ہوئی کا طعنہ تاعمر لڑکی کا پیچھا کرتا رہتا ہے۔'' آج برسوں بعد زرینہ نے اپنا آپ کسی کے سامنے کھولا تھا۔ میرب بڑے دکھ کے ساتھ ان کی باتیں سن رہی تھی۔

''خیر چھوڑو...... میں بھی کیا باتیں لے کر بیٹھ گئی۔'' زرینہ نے آنکھوں کے نم گوشے دوپٹے کے پلو سے خشک کیے۔

''میں جانتی ہوں مہران شاہ کسی طرح بھی تم جیسی لڑکی کے لائق نہیں ہے مگر چندا! کچھ فیصلے انسان کو مجبوری میں کرنے پڑتے ہیں۔ تمہارے والدین حیات ہوتے تو اور بات تھی مگر اب تم اس طرح انکار کرو گی تو سمجھو قیامت آ جائے گی۔ یہ لوگ بہت ظالم ہیں۔ بہتری اسی میں ہے چپ چاپ جو ہوتا ہے ہونے دو۔ اللہ سے مدد مانگو' وہ ضرور تمہیں سیدھا راستہ دکھائے گا۔''

❀❀❀

فیروزہ اپنے میکے جا رہی تھی' اس کے چچازاد کی شادی تھی۔ ساتھ والے گاؤں جانا تھا۔ شہربانو نے میرب کو بھی ہمراہ کر دیا۔ میرب خود بھی گھر بیٹھے بیٹھے بور ہونے لگی تھی سو جانے کے لئے راضی ہوگئی۔ ڈرائیور اور باڈی گارڈ ساتھ تھے۔ راستے میں اچانک گاڑی خراب

ہوگئی۔ڈرائیور کافی دیر سے فالٹ چیک کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔شدید گرمی تھی اور فیروزہ کے دوسالہ مہروز کا رو رو کر برا حال ہو رہا تھا۔

”بھابی‘ گاڑی سے باہر نکل کر ٹہلیں‘ ہوسکتا ہے یہ چپ ہوجائے۔“میرب کے کہنے پر فیروزہ گاڑی سے اتر گئی۔میرب بھی ساتھ ہولی۔

”کیا بات ہے؟ کوئی مسئلہ ہے۔“ایک سیاہ گاڑی ان کی گاڑی کے قریب آ کر رکی تھی۔ڈرائیونگ سیٹ پر موجود وہ شخص ڈرائیور سے مخاطب تھا۔اس کے ساتھ والی سیٹ پر ایک اور شخص بھی موجود تھا۔

”پتا نہیں صاب‘ کیا مسئلہ ہے۔کچھ پتا نہیں چل رہا۔“

”شام ڈھل رہی ہے‘ آپ کے ساتھ خواتین ہیں‘ اگر آپ کہیں تو میں آپ کو پہنچادوں جہاں آپ جانا چاہتے ہیں؟“اس کی آواز میرب اور فیروزہ تک بخوبی پہنچ رہی تھی۔مہروز کا رو رو کر برا حال تھا۔فیروزہ سخت بے چینی محسوس کر رہی تھیں۔

”نہیں صاب‘ آپ کا شکریہ۔“ باڈی گارڈ نے رکھائی سے جواب دیا۔حویلی کی عورتیں کسی غیر کی گاڑی میں جائیں‘ سجان شاہ تو اس کے ٹکڑے کر دیتا۔

”دیکھئے‘ آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔رات ہونے والی ہے اور علاقہ سنسان ہے‘ خواتین کا معاملہ ہے۔اور آپ ہم پر اعتبار کر سکتے ہیں۔ہم شریف لوگ ہیں۔“دوسرا شخص بولا جو مقامی تو ہرگز نہیں لگتا تھا۔

”میرب ٹھیک ہے ہم چلتے ہیں۔تم بھی ہمارے ساتھ آجاؤ۔“فیروزہ نے ایک پل میں فیصلہ کرلیا۔ڈرائیور کو چھوڑ کر وہ دونوں باڈی گارڈ کے ہمراہ سیاہ گاڑی کی طرف بڑھیں۔

”کہاں جانا ہے؟“وہی شخص مسلسل بول رہا تھا جبکہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا شخص خاموش تھا۔میرب نے مطلوبہ جگہ کا نام بتایا۔

”اوہ گڈ‘ شہباز ہم بھی وہیں جارہے ہیں ناں؟“وہ اب دوسرے شخص سے تصدیق کررہا تھا۔باقی کا راستہ خاموشی میں کٹا۔میرب نے ایک سرسری سی نظر اس پر ڈالی جو مسلسل بول رہا تھا۔سرخ وسپید رنگت اور دلکش نقوش والا ہنس مکھ سا شخص لگ رہا تھا۔

”ہم پر اعتبار کرنے کا بہت بہت شکریہ۔“منزل مقصود پر پہنچ کر وہ دھیرے سے دونوں خواتین سے مخاطب ہوا تھا۔

”آپ کی مدد کا شکریہ۔“فیروزہ نے کہا۔میرب خاموش ہی رہی‘ داور خان آفندی نے ایک نگاہ اس سادہ اور خاموش سی لڑکی پر ڈالی جس کی آنکھوں میں ایک حزن سا تیرتا نظر آیا تھا۔

”ہیلو‘ کیسی ہیں آپ؟“مہندی کی تقریب زوروں پر تھی دلہا کے ساتھ چند قریبی دوستوں کو زنان خانے میں آنے کی اجازت تھی۔شہباز کے ساتھ وہ بھی اندر آیا تو میرب بھی اس کی نظروں کی گرفت میں آ گئی۔میرب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”آ......آپ!“وہ کچھ بوکھلا سی گئی۔حویلی کے قاعدے وہ جان چکی تھی۔کسی اجنبی مرد سے بات کرنا قابل گرفت تھا۔

”آپ نے مجھے پہچانا نہیں شاید۔“

”جی......وہ میں......جی نہیں۔“وہ سراسیمگی سے کہتی وہاں سے ہٹ گئی۔

”کمال ہے‘ عجیب لڑکی ہے۔“داور خان محض کندھے اچکا کر رہ گیا۔

یہ دومنٹ کی ملاقات فیروزہ اور شہربانو کی نظروں سے مخفی نہ رہ سکی تھی۔شہربانو صبح ہی پہنچی تھیں۔شہربانو کا شکی دماغ تانے بانے بنے لگا تھا۔ویسے سے اگلے دن ان لوگوں کی واپسی تھی۔

فیروزہ کی چھوٹی بہنوں اور چچازاد کزنز سے میرب کی اچھی بننے لگی تھی۔میرب کو وہ لڑکیاں اچھی لگی تھیں۔سب لڑکیاں شہربانو سے اجازت لے کر میرب کو اپنے ہمراہ زمینوں کی سیر پر گئی تھیں۔وہاں جا کر سبھی لڑکیاں تتر بتر ہوگئیں۔میرب نہر کنارے قدرے پرسکون سے گوشے میں بیٹھ گئی۔حالانکہ شہربانو نے سب لڑکیوں کو خاص تاکید کی تھی کہ میرب کو تنہا نہیں چھوڑنا مگر سب لڑکیاں ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال چکی تھیں۔جوتے اتار کر سائیڈ پر رکھے اور پائنچوں کو تھوڑا سا فولڈ کر کے وہ دونوں پیر نہر کے ٹھنڈے پانی میں ڈال کر بیٹھ گئی۔

''مائی گاڈ! یہ کیسا حسین اتفاق ہے کہ آپ ہر اس جگہ پر موجود ہوتی ہیں جہاں میں ہوتا ہوں۔'' شوخ مردانہ آواز پر وہ چونکی تھی۔ داور خان کچھ ہی فاصلے پر موجود تھا۔ میرب نے بے تاثر سے انداز میں چہرے کا رخ بدل لیا۔

''آئی ایم سوری' مجھے لگتا ہے آپ کو میرا یوں بے تکلف ہونا برا لگا ہے۔'' وہ یکلخت سنجیدگی سے کہتا پلٹنے لگا۔

''سنئے۔'' وہ جانے کیوں اسے پکار بیٹھی۔

''جی!''

''دراصل میں......'' وہ کچھ کہنا چاہتی تھی دفعتاً اس کی نظر سامنے جھاڑی میں موجود سانپ پڑی۔ وہ چیخ مار کر اٹھی۔ توازن برقرار نہ رکھ پائی اور نہر میں جا گری۔

''اوہ نو۔'' داور خان نے بلا سوچے سمجھے نہر میں چھلانگ لگا دی تھی۔ میرب کی چیخیں سن کر لڑکیاں اس طرف چلی آئیں اور جو منظر ان سب کی آنکھوں نے دیکھا' اپنی اپنی مرضی کے مطلب اخذ کر لئے' میرب کا بھیگا وجود داور خان کی پناہ میں تھا' وہ اسے کنارے تک لا رہا تھا۔

داور خان شادی کی تقریب میں شرکت کے بعد واپسی کے سفر کی طرف گامزن تھا جب گاڑی میں پانی ختم ہو جانے کے باعث وہ پانی لینے نہر کی طرف آیا تھا۔ میرب کو بیٹھے دیکھ کر وہ بات کئے بنا رہ نہ پایا تھا۔ یہ سادہ سی لڑکی اسے اچھی لگنے لگی تھی۔ شومئی قسمت فیروزہ کے بھائی نے بھی یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ داور خان تو جا چکا تھا میرب ابھی تک سراسیمہ سی تھی۔ حویلی پہنچی تو ایک اور قیامت اس کی منتظر تھی۔ یہ خبر زبان زد عام ہو چکی تھی کہ سبحان شاہ کی ہونے والی بہو اور بھتیجی ایک غیر مرد کے ساتھ قابل اعتراض حالت میں دیکھی گئی تھی۔

''اس گند کو جلد از جلد ختم کرو۔''

میرب تو گویا سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے بے بہرہ ہو چکی تھی۔ وہ اپنی صفائی میں بولنا چاہتی تھی مگر الفاظ ساتھ ہی نہ دے رہے تھے۔ آواز حلق میں اٹکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''اچھا تو یہی تھا وہ جس کی وجہ سے یہ شادی سے انکار کر رہی تھی۔'' شہر بانو کی زہریلی آواز سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔

''ارے اسے تو ڈھونڈو جو اس کھیل میں برابر کا شریک ہے' جس کی شہ پر یہ انکار کر رہی تھی۔''

''مار ڈالو اس کمینے کو جس نے ہمارے خاندان کی عزت سے کھیلنا چاہا۔'' جتنے منہ' اتنی باتیں' میرب کو قید کر دیا گیا تھا۔ داور خان کی تلاش میں کافی لوگ گئے تھے' مگر وہ ان کی حدود سے نکل چکا تھا۔ اس بیچارے کو تو علم ہی نہیں تھا کہ اس کے پیچھے کیسی قیامت آ چکی تھی۔

میرب نے ساری رات روتے ہوئے گزاری تھی۔ اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو کر وہ خوب گڑگڑائی تھی۔ وہ ایسی ذلت کی موت نہیں مرنا چاہتی تھی اور شاید تب ہی کاتب تقدیر کو اس پر رحم آ گیا۔ رات کو کھانا دینے کے بعد ملازمہ دروازے کو تالا لگانا بھول گئی تھی۔ تہجد کے بعد میرب کی نظر اس پر پڑی۔ بڑی سی شال اپنے گرد لپیٹ کر وہ چھپتی چھپاتی بمشکل گیٹ تک پہنچی تھی۔ گیٹ پر موجود دونوں پہرے دار اونگھ رہے تھے۔ جانے اس میں اتنی ہمت کہاں سے آ گئی تھی۔ دیواریں زیادہ اونچی نہ تھیں۔ درخت کے مضبوط تنے پر چڑھ کر وہ دیوار پھلانگ گئی۔ تیز تیز قدموں سے چلتی وہ اللہ کا نام لے کر ایک سمت کو چل پڑی۔ وہ نہیں جانتی تھی یہ راستہ کس طرف جاتا ہے۔ صبح کی روشنی پھیلنے لگی تھی۔ کچے پر سے ہوتی وہ پکی سڑک کی طرف نکل آئی۔ سیاہ کولتار کی سڑک سنسان پڑی تھی۔ دور دور تک کسی ذی روح کا نام و نشان نہ تھا۔ وہ دھڑکتے دل سے چلی جا رہی تھی۔ تبھی دور سے بس آتی دکھائی دی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے بس کو روکا اور رکتے ہی فوراً سوار ہو گئی۔

❁❁❁

''کہاں مر گئے تھے سب کے سب کہ ایک بالشت بھر کی چھوکری سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر بھاگ گئی۔ سبحان شاہ غضبناک ہو کر گرجے۔ فیضان شاہ بھی خاصے غصے میں تھے۔ سب لوگ اپنے گاؤں واپس آ چکے تھے۔ یہ سن کر کہ میرب ان کی قید سے فرار ہو گئی ہے' زرینہ کو گونا گوں سکون کا احساس ہوا تھا۔

''بابا میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اسے پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالوں گا۔ وہ اور اس کا عاشق اب میرے ہاتھوں سے نہیں بچ سکتے۔'' مہران شاہ کے سینے میں آگ بھڑک رہی تھی۔

''اس لڑکے کا پتا کرو وہ کون تھا اور کہاں سے آیا تھا۔''

''قاسم (فیروزہ کا چچازاد) کے چھوٹے بھائی کے کسی جاننے والے کے ساتھ آیا تھا۔ کون تھا' کہاں سے آیا تھا' کوئی نہیں جانتا۔ یوں بھی شادی میں شرکت کی کھلے عام دعوت دی گئی تھی۔ بہت سے اجنبی موجود تھے۔'' فیضان شاہ نے بتایا۔

''مجھے تو یہ پرانا چکر لگتا ہے۔ فیروزہ بتا رہی تھی کہ راستے میں جب گاڑی خراب ہوئی تو اسی لڑکے نے انہیں لفٹ دی تھی۔ قاسم کی مہندی والے دن میں نے انہیں اپنی آنکھوں سے میرب کو اس لڑکے سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔'' شہر بانو نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

''وہ لڑکی ہماری سوچ سے بھی زیادہ چالاک اور تیز نکلی۔ یہ پڑھی لکھی شہری لڑکیاں ایسی ہی چلتر باز ہوتی ہیں۔'' طاقت اور دولت کے نشے میں چور' سبحان شاہ یہ بھول گئے تھے کہ وہ کوئی غیر نہیں ان کی سگی بھتیجی تھی۔ جس کے پاکدامن پر وہ کیچڑ اچھال رہے تھے۔

''آپ فکر نہ کریں بابا وہ میری منگ تھی اور میری غیرت اس کو مارے بنا چین سے نہیں بیٹھنے دے گی مجھے۔'' مہران شاہ گویا جلتے انگاروں پر لوٹ رہا تھا۔

''ہمیں وہ چاہیے' زندہ یا مردہ۔'' سبحان شاہ سفاکی کی ہر حد پار کر چکے تھے۔

❀❀❀

بس ایک چھوٹے سے اسٹاپ پر رکی تو وہ بنا سوچے سمجھے اتر گئی۔ اس کے پاس پھوٹی کوڑی نہ تھی۔ کنڈیکٹر کو اپنی قیمتی رسٹ واچ دے کر راضی کیا تھا۔ قریب ہی ریلوے اسٹیشن تھا۔ وہ لاہور جانے والی ٹرین میں سوار ہو گئی تھی۔ کراچی جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ سبحان شاہ سب سے پہلے اس کی تلاش میں وہیں پہنچتے۔ ''ہوسکتا ہے وہ وہاں پہنچ بھی چکے ہوں'' وہ محض سوچ کر رہ گئی۔ سارا راستہ واہموں اور اندیشوں میں کٹا تھا۔ حسین اور جوان لڑکی اور وہ بھی تنہا' دنیا بھیڑیوں سے بھری پڑی ہے جو شکار کی تلاش میں گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ پلیٹ فارم پر ہی تین لڑکے اس کے پیچھے لگ گئے تھے۔ خود کو بڑی سی شال میں چھپائے وہ تیز تیز قدم اٹھاتی پلیٹ فارم سے نکلی تھی۔

''کتھے جا رہے ہو سوہنیو؟''

''ہم چھوڑ آئیں؟''

وہ لڑکے اس کے دائیں بائیں چلنے لگے تھے۔ مارے خوف کے اس کے پسینے چھوٹ گئے۔ قدموں کی رفتار تیز ہو گئی۔

''شہزادی ہم سے کیا ڈرنا۔''

''مم...... میرا پیچھا چھوڑ دو۔'' وہ تقریباً منمنائی تو وہ تینوں لفنگے بے ہنگم قہقہے لگانے لگے۔ سامنے ہی ایک سیاہ گاڑی رکی ہوئی تھی۔ اس میں بیٹھے شخص نے بھی یہ منظر دیکھا تھا۔ ایک لڑکے نے میرب کے دوپٹے کا کونہ پکڑا تو اس کے سر سے دوپٹہ ڈھلک گیا۔ میرب کو یوں لگا جیسے وہ سر عام بے عزت کر دی گئی ہو۔ اس نے طیش میں آکر اس لڑکے کو تھپڑ دے مارا تھا اور فوراً دوڑ لگا دی تھی۔ تینوں لڑکے اس کے پیچھے بھاگے' بھاگتے ہی وہ کسی سے بری طرح ٹکرائی تھی۔ دو مضبوط بازوؤں نے سرعت سے اس کے وجود کو تھام کر گرنے سے بچایا تھا۔ میرب نے سر اٹھا کر دیکھا تو اس کی نگاہوں میں شناسائی کی چمک دکھائی دی۔ شناسا نہ ہوتے ہوئے بھی وہ ایک دوسرے کے لئے اجنبی نہیں تھے اور پھر میرب نے دیکھا کہ وہ اکیلا ان تینوں سے بھڑ گیا تھا۔ ذرا سی ٹھکائی کے بعد وہ لڑکے بھاگ گئے تھے۔

''آؤ بیٹھو۔'' داور خان نے اس کے لئے فرنٹ ڈور کھولا تو وہ میکانکی انداز میں بیٹھ گئی۔ اس کے بیٹھتے ہی گاڑی چل پڑی۔ داور نے ایک نظر اس پر ڈالی جو شاید گہرے شاک کے زیر اثر تھی۔ گم صم' ایک ٹک نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ اس لڑکی سے یکسر مختلف جس سے وہ اس روز شادی میں ملا تھا۔ شہباز کے دوست کے بھائی کی شادی میں شرکت کرنے کا اس کا کوئی ارادہ نہ تھا مگر شہباز کے سامنے اس کی ایک نہیں چلی تھی۔ پہلی ملاقات میں تو اس نے اسے دیکھا بھی نہیں تھا ٹھیک سے۔ ہاں دوسری بار مہندی والے روز اسے دیکھا تو عجیب سی اپنائیت

کا خوشگوار سا احساس ہوا تھا۔ گم صم اور خاموش سی یہ لڑکی اسے اچھی لگی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ وہ پہلی نظر میں اس کی محبت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ محبت تو بہت دور کی بات تھی' وہ تو محض پسندیدگی کی سند ہی پا سکی تھی۔ داور خان تو یوں بھی پلوشے سے منسوب تھا جو اس کے دادا جلال خان کے چچازاد بھائی کی نواسی تھی۔ پلوشے سے اس کا رشتہ سو فیصد بڑوں کی مرضی سے طے ہوا تھا مگر وہ پھر بھی پابند تھا۔ شہباز کو ولیمے والے دن ہی اچانک جانا پڑ گیا تھا۔ اس لئے واپسی کے سفر میں وہ تنہا تھا۔ میرب کو نہر میں ڈوبتا دیکھ کر ایک لمحے کو اسے اپنی سانسیں بند ہوتی محسوس ہوئی تھیں۔ وہ بنا سوچے سمجھے نہر میں کود گیا تھا۔

''گاڑی روکئے پلیز۔'' میرب کی آواز پر وہ خیالات کی یورش سے باہر نکلا تھا۔ بے اختیار اس کا پاؤں بریک پر جا پڑا تھا۔ میرب کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا تھا۔

''اوہ آئی ایم سوری۔'' داور نے پہلی بار بغور اسے دیکھا تھا۔ سرخ ہوتی ناک اور آنکھیں اس کی مسلسل گریہ آہ وزاری کی غماز تھیں۔

''مجھے کسی بس اسٹاپ پر اتار دیں۔''

''بس اسٹاپ پر اتار دوں تاکہ اسی طرح کے غنڈے آپ کے پیچھے لگ جائیں۔'' وہ ایک لمحے کو رکا۔ ''بائی دی وے آپ کو جانا کہاں ہے؟ مجھے بتائیے' میں ڈراپ کر دیتا ہوں۔''

''مم...... میں...... معلوم نہیں۔'' وہ سخت ہراساں لگ رہی تھی۔ داور خان کو کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوا تھا۔

''کوئی مسئلہ ہے؟ آپ اور یوں تنہا؟ میرا مطلب ہے آپ کا تعلق تو خاصی اچھی اور با اثر فیملی سے ہے۔''

''یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔'' وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی تھی۔ داور اس کے رونے پر بوکھلا اٹھا تھا۔

''میری وجہ سے؟ میں سمجھا نہیں۔'' وہ مسلسل روتی رہی۔

''دیکھئے پلیز کھل کر بتائیے' کیا مسئلہ ہے؟ اور میری وجہ سے آپ کی کیا مراد ہے؟'' وہ بیچارہ سچ مچ بوکھلا گیا تھا۔

''آئی ایم سوری' میں شاید کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گئی تھی۔'' رونے کا زور کم ہوا تو وہ شرمندگی سے گویا ہوئی۔ اس کی طرح وہ بھی تو بے قصور تھا۔ اسے تو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ ذرا سی ہمدردی کرنے پر اسے...... واجب القتل قرار دے دیا گیا تھا۔

''پلیز مجھے کھل کر بتائیے' بات کیا ہے؟'' داور کے پوچھنے پر اس نے ساری بات من وعن گوش گزار کر دی۔ حقیقت جاننے کے بعد وہ بھی پریشان نظر آ رہا تھا۔

''آپ کہیں تو میں آپ کے ساتھ چل کر گواہی دینے کو تیار ہوں۔'' داور کے کہنے پر میرب نے سہم کر اسے دیکھا۔

''بھول کر بھی ایسی غلطی مت کیجئے گا۔ میرے تایا بہت ظالم ہیں' دولت کی ہوس میں وہ میرے ساتھ ساتھ آپ کی جان لینے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔''

''تو پھر کیا کیا جائے؟'' وہ پرسوچ اور متفکر انداز میں دائیں انگشت شہادت پیشانی پر پھیرنے لگا تھا۔

''آپ مجھے کسی دارالامان تک چھوڑ دیجئے۔ میرب کے کہنے پر داور نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

''میں ایسا نہیں کر سکتا۔'' وہ قطعی لہجے میں گویا ہوا۔

''کیا مطلب؟''

''انسانیت کے ناتے ہی سہی مگر میں آپ کو تنہا یوں بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتا۔''

''مگر میں اپنی وجہ سے آپ کی زندگی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتی۔

''آپ میری فکر نہ کریں۔ آپ کا نام میرے نام کے ساتھ لیا گیا۔ نادانستگی میں ہی سہی' پر آپ کو مخاطب کرنے کی غلطی بہر حال میری ہی تھی۔ اگر مجھ پر اعتبار ہو تو چپ چاپ وہی کیجئے جو میں کہتا ہوں۔'' یکلخت داور خان کا لہجہ اٹل ہو گیا تھا۔ یوں لگتا تھا گویا وہ کسی فیصلے تک پہنچ گیا ہے۔ میرب تذبذب کے عالم میں تھی۔ بہر حال تھا تو وہ اجنبی' آنکھیں بند کر کے بھروسہ بھی نہیں کر سکتی تھی اور اس کے علاوہ کوئی

دوسرا مددگار بھی نظر نہ آ رہا تھا۔ آنکھیں پانیوں سے دھندلا گئی تھیں۔ تبھی شاید اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن چمکی تھی۔

''ماموں! ہاں میرے ماموں کا کانٹیکٹ نمبر ہے میرے پاس۔ اور یہ شخص مجھے ان تک پہنچانے میں مدد کر سکتا ہے۔'' ڈوبتے دل کو تسلی ہوئی تھی۔ گاڑی ایک پیٹرول پمپ پر رکی تو وہ چونکی۔ داور خان موبائل پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ میرب کا دل پھر وسوسوں کا شکار ہونے لگا۔

''اف! میں کیا کروں' کہاں جاؤں۔ اللہ! تو ہی میرے حال پر کرم کرنے والا ہے۔'' وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ گئی۔

''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''جی میں ٹھیک ہوں۔ یہاں سے سر درد کی گولی مل جائے گی؟''

''میں دیکھتا ہوں۔'' وہ گاڑی سے اتر کر پٹرول پمپ پر بنی ٹک شاپ تک چلا گیا۔

''یہ لیجیے۔'' ایک بڑا سا لفافہ اس کی طرف بڑھایا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ جوس کے ڈبے' بسکٹس' چپس کے پیکٹ' سافٹ ڈرنک اور دو گولیاں سر درد کی۔ اس نے دونوں گولیاں منرل واٹر کے ساتھ پھانک لیں اور باقی کی چیزیں پچھلی سیٹ پر رکھ دیں۔ باقی کا سارا سفر طویل خاموشی میں کٹا تھا۔ داور خان اسے اپنے گھر لے آیا تھا۔ جلال خان کو فون پر وہ ساری سچویشن بتا چکا تھا۔ گھر میں دو ملازمائیں تھیں۔ داور کے ماں باپ ایک حادثے میں انتقال کر چکے تھے۔ جلال خان نے ہی دونوں پوتوں کو پالا تھا۔ سالار پڑھنے کی غرض سے امریکہ میں تھا۔ میرب کو یہاں آ کر بالکل اجنبیت کا احساس نہیں ہوا تھا۔ دن یونہی گزر رہے تھے جب اچانک ہی زندگی کی شاہراہ پر ایک نیا موڑ سامنے آ گیا۔

داور کے سسرالیوں نے منگنی توڑنے کا اعلان کر دیا تھا اور وجہ یہ بتائی تھی کہ داور نے میرب سے خفیہ نکاح کیا ہوا ہے۔ جلال خان نے بہتیرا سمجھایا مگر وہ لوگ نہ مانے۔ وہ شاید پہلے ہی رشتہ توڑنا چاہتے تھے۔ اب یہ جواز بنا کر رشتہ توڑ رہے تھے۔ داور کسی قیمت پر رشتہ توڑنے کو تیار نہ تھے۔ یہ نہیں تھا کہ اسے پلوشے سے کوئی طوفانی قسم کا عشق تھا۔ بس اس نے اس بات کو اپنی غیرت کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ جرگے نے بھی داور خان کے حق میں فیصلہ کیا اور پلوشے کے والدین کو اس رشتے کا پابند رہنے کی تاکید کی مگر چند دنوں بعد ہی پلوشے کی موت کی خبر ملی۔ اس کی موت ایک معمہ تھی۔ شاید اس نے خودکشی کی تھی' ایک عجیب سی اداسی نے در و دیوار کو گھیر رکھا تھا۔ میرب جانے کیوں خود کو مجرم سمجھنے لگی تھی۔

''داجی' مجھے معاف کر دیں' مجھے لگتا ہے یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔'' ایک روز وہ داجی کے قدموں میں گر کر رو پڑی تھی۔

''پگلی! تم کیوں خود کو مجرم سمجھتی ہو۔'' داجی تو یوں بھی میرب سے پیار کرنے لگے تھے۔ داجی کی ہی خواہش پر میرب اور داور کا نکاح کر دیا گیا۔ شاید داور بھی ایسا چاہتا تھا۔ سادگی سے نکاح کیا گیا اور رخصتی کی تقریب دو ماہ بعد سالار آفندی کی آمد تک موقوف کر دی گئی۔ نکاح ہونے کے بعد بھی میرب کا دل کسی بھی احساس سے خالی تھا۔ شاید وہ ذہنی طور پر تیار نہ تھی۔ داور خاصا ریزرو سا بندہ تھا۔ نکاح کے دوسرے دن ہی وہ کسی کام سے اسلام آباد چلا گیا تھا۔

گیا تو وہ اپنے کسی کام سے تھا مگر واپسی اس کی چار کاندھوں پر ہوئی تھی۔ اسلام آباد جاتے ہوئے وہ راستے میں کسی اندھی گولی کا شکار ہو گیا تھا۔ داور خان کا قاتل کون تھا' یہ کوئی نہیں جانتا تھا' آفندی لاج' کے در و دیوار تک اس جواں مرگ پر لرز اٹھے تھے۔ جلال خان جوان پوتے کی موت کی خبر سنتے ہی دل ہار بیٹھے تھے۔ انہیں ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ دو دن وہ زندگی و موت کی کشمکش میں آئی سی یو میں رہے تھے۔ سالار خان جو دو ماہ بعد آنے والا تھا۔ اس المناک حادثے کی خبر سنتے ہی دوڑا چلا آیا تھا۔ جان سے زیادہ پیارے بھائی کی موت نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ جانے کس طرح خود پر ضبط کیے ہوئے تھا۔ آنسوؤں پر قابو پاتے پاتے وہ تھکنے لگا تھا۔ تنہائی میں خوب رویا تھا مگر جلال خان آفندی کو دلاسا دیتے وقت وہ بالکل خاموش تھا۔ شدت ضبط سے اس کی آنکھیں لہو رنگ ہو چلی تھیں۔ میرب کا الگ برا حال تھا۔ وہ تقدیر کے اس کاری وار کو سہنے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی۔ جلال خان کی جی جان سے تیمارداری کر رہی تھی مگر لبوں پر گویا قفل پڑ گئے تھے۔ وہ اپنے آپ کو مجرم سمجھنے لگی تھی۔ اس کا دل کہتا تھا کہ داور خان کی موت کی ذمہ دار وہ ہے۔ اسے سو فیصد یقین تھا کہ سبحان شاہ اور

مہران شاہ نے ہی داور خان کو قتل کرایا ہوگا۔ سالار یہ تو جانتا تھا کہ داور خان کا نکاح ہوا ہے مگر یہ نہیں جانتا تھا کہ میرب سے ہوا ہے۔ چند دنوں بعد حواس ٹھکانے آئے تو احساس ہوا کہ یہ لڑکی جو دن رات داجی کی خدمت میں مصروف تھی۔ وہ اس کے لئے اجنبی تھی۔

''داجی...... یہ لڑکی کون ہے؟'' اس کے پوچھنے پر داجی نے ایک سرد آہ بھری تھی۔

''یہ بدنصیب ہی تو داور کی منکوحہ ہے۔'' اور پھر داجی نے سارے حالات سالار کو سنا ڈالے تھے۔ جس پر وہ محض خاموش ہی رہا تھا۔

❁❁❁

''کون...... کون ہے؟'' داجی کو پیروں پر نمی کا احساس ہوا تو اٹھ بیٹھے۔ میرب ان کے پیروں پر سر رکھے بے آواز رو رہی تھی۔

''میرو' میرو بیٹا' یہ کیا بیوقوفی ہے؟'' داجی نے اس کے سر کو تھپکتے ہوئے کہا۔

''داجی...... مجھے معاف کر دیں۔ پلیز مجھے معاف کر دیں۔''

''کس بات کی معافی بیٹا؟''

''داجی' یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ داور خان کی موت کی ذمہ دار میں ہوں۔'' وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی جبکہ دہلیز پر کھڑا سالار چونک کر وہیں رک گیا تھا۔ جلال خان بھی ایک لمحے کو ورطہ حیرت میں کھو گئے تھے۔

''یہ...... یہ کیا کہہ رہی ہو میرب؟''

''ہاں داجی' مجھے پورا یقین ہے کہ داور خان کو مہران شاہ نے مارا ہے۔'' وہ سسکنے لگی تھی۔ ''کاش...... کاش میں داور خان کے ساتھ نہ آئی ہوتی۔'' وہ رو رہی تھی جبکہ سالار خان واپس پلٹ چکا تھا۔

''پگلی اس میں بھلا تمہارا کیا قصور ہے۔ اللہ کو یہی منظور تھا۔'' داجی بھی آبدیدہ ہو گئے تھے۔

''چلو اٹھو...... یہاں میرے پاس آ کر بیٹھو۔'' داجی کے کہنے پر وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔ ''دیکھو بیٹا ہر کام اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے۔ بندے تو محض بہانہ بن جاتے ہیں۔ ورنہ تقدیر کا لکھا کوئی مٹا سکا ہے بھلا؟ تم خود کو کیوں قصوروار سمجھتی ہو؟ تم کیا جانو تم میرے لئے کیا ہو؟ داور کے حوالے سے تو مجھے اور بھی عزیز ہو گئی ہو۔ تم ہماری عزت ہو...... ہم تمہیں خود سے جدا کرنے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتے۔ ہمیں لگتا ہے رب نے ہماری کھوئی ہوئی بیٹی ہمیں لوٹا دی ہے۔'' جلال خان کا پرشفیق انداز میرب کے دل پر پڑے بھاری بوجھ کو کسی حد تک کم کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

دن بدن وہ جلال خان کو اور زیادہ عزیز ہوتی جا رہی تھی جبکہ سالار خان کی نگاہوں میں اس کے لئے سوائے نفرت اور تحقیر کے اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ اس نے کبھی میرب کو مخاطب نہیں کیا تھا۔ وہ جہاں موجود ہوتی' وہ وہاں سے اٹھ کر چلا جاتا۔ میرب کے ساتھ ساتھ جلال خان نے بھی سالار کے رویے کو نوٹ کیا تھا۔ وہ سالار کو ٹوکے بنا نہ رہ سکے۔

''سالار خان! وہ کوئی اچھوت نہیں' اس گھر کی عزت ہے۔''

''گستاخی معاف داجی! مگر میں ایسا نہیں سمجھتا۔''

''کیا مطلب؟''

''جس لڑکی کی وجہ سے میرا بھائی مجھ سے جدا ہوا' اس کی میری نظر میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔''

''سالار خان' وہ تو خود بیچاری مظلوم لڑکی ہے۔''

''داجی...... ہماری کسی سے ذاتی دشمنی تو نہیں تھی نا' ایک غیر لڑکی کی وجہ سے داور خان ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا ہے۔''

''اس میں میرب کا کیا قصور ہے؟''

''مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ ایک اجنبی اور یکسر انجان لڑکی سے آپ کو اتنی ہمدردی کیوں ہو رہی ہے؟''

''وہ غریب تمہیں کیا کہتی ہے' تم نے اس سے کیوں بیر باندھ لیا ہے؟''

''مجھے اس لڑکی سے شدید نفرت ہے۔ میں اسے صرف آپ کی وجہ سے برداشت کر رہا ہوں ورنہ میرا بس چلے تو اسے ایک پل بھی یہاں نہ ٹکنے دوں۔ جانے کون ہے؟ کس خاندان کی ہے؟ کردار کیسی ہے؟''

''دوسرے لفظوں میں تم داور خان کے کردار پر بھی شک کر رہے ہو؟'' جلال خان نے اس کی بات قطع کی تو وہ ایک لمحے کو خاموش سا ہو گیا۔

''جب تک میں زندہ ہوں، وہ اس گھر میں رہے گی۔ وہ اس گھر کی عزت ہے، تم نہیں مانتے تو تمہاری مرضی۔ میں تمہیں مجبور نہیں کر رہا، ہاں میرے مرنے کے بعد......''

''پلیز داجی......'' وہ تڑپ کر بولا تھا۔ جلال خان کا روٹھا روٹھا سا انداز اس سے برداشت نہیں ہو پایا تھا۔ دادا پوتے کے مابین ہونے والی یہ گفتگو نادانستہ طور پر ہی میرب نے بھی سنی تھی۔ اتنی تحقیر، اتنی نفرت، وہ تھرا کر رہ گئی۔ ''شاید سالار خان بھی ٹھیک ہی کہتا ہے۔'' ایک آہ اس کے لبوں پہ آ کے دم توڑ گئی تھی۔ وہ چپ چاپ واپس پلٹ گئی تھی۔ وہ اب قصداً سالار آفندی کے سامنے آنے سے گریز کرتی تھی۔ دونوں کے درمیان ایک سرد جنگ سی چل رہی تھی۔ سالار اسے بھائی کی بیوہ سمجھ کے بھی عزت دینے کو تیار نہ تھا۔ یہ سب میرب کا خیال تھا۔ اس نے بھی لبوں کو قفل لگا لئے تھے۔ داجی کا آسرا غنیمت جان کر وہ خاموشی سے وہاں رہ رہی تھی۔ اگر پہلے سے حالات ہوتے تو وہ سالار آفندی کی اتنی نفرت اور حقارت کبھی برداشت نہ کرتی مگر اب وہ مجبور تھی۔ یہ سب سہنے کو، حالات نے اسے یکلخت ہی عرش سے فرش پر لا پٹخا تھا۔ زندگی ایک ہی معمول سے چل رہی تھی کہ ایسے میں صارم رضا کی آمد اور مستزاد شادی کی پیشکش نے اس کی زندگی کے ساکت پانیوں میں ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔

ساری رات آنکھوں میں کٹی تھی۔ موذن نے فجر کی اذان دی تو وہ چونکی۔ ماضی سے حال تک کا سفر اتنا تکلیف دہ نہیں ہوتا جتنا حال سے ماضی کا اور اس کا ماضی صرف اور صرف تکلیف دہ یادوں سے بھرا تھا۔

❁❁❁

صارم رضا خاموشی سے واپس چلا گیا تھا۔ یہ جان کر میرب کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

''تم بھلا اس دنیا کے مردوں سے مختلف کیسے ہو سکتے تھے؟''

''میرو...... بیٹا! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' اس کی سوجی سوجی سرخ ہوتی آنکھوں کو دیکھ کر جلال خان پوچھے بنا نہ رہ سکے تھے۔

''جی داجی۔'' وہ نگاہیں جھکا کر بولی۔

''ادھر دیکھو، میری طرف۔'' داجی نے اپنے دائیں ہاتھ سے اس کا چہرہ اپنی طرف کیا۔ ''کوئی مسئلہ ہے؟'' وہ نفی میں سر ہلا گئی۔

''سالار نے کچھ کہا ہے؟'' وہ لب کاٹتے ہوئے نفی میں سر ہلانے لگی۔ ''بیٹا' وہ دل کا برا نہیں ہے، داور سے بہت پیار کرتا تھا وہ۔''

''نہیں داجی، سالار نے مجھے کچھ نہیں کہا ہے۔ مجھے ان سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ وہ بھی ٹھیک کہتے ہیں۔ میری وجہ سے ان کا بھائی ان سے جدا ہوا۔ وہ مجھ سے نفرت کرتے ہیں مجھے برا نہیں لگتا...... میں...... میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔'' اس نے جی کڑا کر کے کہہ ڈالا۔

جلال خان کے چہرے کا رنگ یکلخت بدلا تھا۔

''ہمیں افسوس ہے کہ ہماری محبت میں اتنی طاقت نہیں ہے جتنی سالار خان کی نفرت میں ہے۔ میرب...... تم، تم چلی جاؤ۔ تم بھی چلی جاؤ، تنہا چھوڑ دو ہمیں۔ ہم شروع سے ہی بدقسمت رہے ہیں۔ جب بھی کسی سے پیار کیا، وہ ہمیں چھوڑ کر چلا گیا۔ پہلے یارو اور گل مینہ، پھر زرمینہ، پھر داور اور اب تم...... چلی جاؤ۔ تم بھی چلی جاؤ۔ ہمیں...... ہمیں'' وہ ہانپنے لگے تھے۔ شدت جذبات سے چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ سانس پھول رہی تھی۔ جلال خان واقعی جلال میں آ گئے تھے۔

''داجی...... آپ...... آپ کی طبیعت......'' وہ گھبرا کر آگے بڑھی تو جلال خان نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

''چلی جاؤ...... ہمیں...... ہمیں تمہاری...... ہمدردی کی ضرورت......'' وہ لہرا کر بستر پر آ رہے تھے۔

''داجی۔'' وہ چلائی۔ ''سالار......رحیم خان......'' وہ داجی کے پیروں کے تلوے سہلا رہی تھی۔ سالار جو اسی طرف آ رہا تھا۔ بجلی کی سی تیزی سے اندر آیا۔ رحیم خان اور گل رانو اس کے پیچھے تھے۔

''داجی! داجی کیا ہوا؟'' وہ لپک کر ان کے پاس آیا تھا۔ رحیم خان جلدی سے گاڑی نکالو۔'' وہ سخت گھبرا گیا تھا۔ ''تم......تم نے کیا کہا ہے داجی سے؟ بولو۔'' وہ میرب کو قہر برساتی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

''میں......میں......نے تو......'' وہ مارے خوف کے بول ہی نہ پائی تھی۔ ''نہیں میں نے تو......'' وہ سراسیمگی سے کہتی دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

''اگر میرے داجی کو کچھ ہو گیا تو میں تمہیں جان سے مار دوں گا میرب احسان۔'' اس کے لہجے میں اژدھے کی سی پھنکار تھی۔ وہ داجی کو لے کر ہاسپٹل چلا گیا تھا۔ میرب کا دل سوکھے پتے کی مانند لرز رہا تھا۔ برستی آنکھوں اور کپکپاتے لبوں سے وہ صرف ایک ہی دعا مانگ رہی تھی۔ داجی کی سلامتی کی دعا! اس لئے نہیں کہ اسے سالار خان کا خوف تھا۔ اس لئے کہ اب داجی ہی اس کا واحد آسرا تھے۔ ''خدانخواستہ انہیں کچھ ہو گیا تو میں کہاں جاؤں گی؟'' یہ سوچ کر ہی وہ لرز اٹھی۔ حالانکہ کچھ دیر پہلے وہ یہاں سے جانے کی بات کر رہی تھی۔ مگر کہنے اور سہنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ یہ اسے اب پتا چلا تھا۔ دو گھنٹے مسلسل ایک ہی پوزیشن میں بیٹھے بیٹھے اس کی ٹانگیں اکڑ گئی تھیں۔ تبھی گیٹ پر گاڑی کے ہارن کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ دوڑ کر باہر تک گئی تھی۔ رحیم خان اور گل رانو آئے تھے۔

''داجی......داجی کی طبیعت کیسی ہے؟''

''ابھی ان کا حالت خطرے میں ہے۔ ڈاکٹر بولتا ان کو دل کا دورہ پڑا ہے۔ چھوٹا خان بہت پریشان لگ رہا تھا۔ ام نے پہلی بار اس کو روتے ہوئے دیکھا بی بی۔'' گل رانو نے تفصیلاً جواب دیا تو میرب کو لگا اس کے جسم میں جان ہی نہیں رہی۔

''مم......مجھے ہاسپٹل لے جاؤ رحیم خان۔''

''بی بی......وہ چھوٹا خان......'' رحیم خان کچھ تذبذب کا شکار لگ رہا تھا۔

''تم مجھے ہاسپٹل کا نام بتا دو۔ میں خود چلی جاؤں گی۔'' وہ سمجھ گئی رحیم خان کو سالار نے منع کیا ہو گا۔

''بی بی......خان ام کو مار ڈالے گا۔''

''کچھ نہیں کہے گا وہ تمہیں۔'' اور پھر رحیم خان ہی اسے ہسپتال چھوڑ کر آیا۔ داجی سی۔ سی۔ یو میں تھے۔ کاریڈور میں ہی اسے سالار خان فکرمندی سے ٹہلتا نظر آ گیا۔ وہ جی کڑا کر کے اس کے پاس چلی آئی۔

''داجی کیسے ہیں اب؟''

سالار نے ایک قہر برساتی نظر اس پر ڈالی اور بنا جواب دیئے رخ موڑ گیا۔

''داجی......کی طبیعت کیسی ہے؟'' ڈھیٹ بنی وہ دوبارہ اس سے پوچھ رہی تھی۔

''میرب احسان! داجی کے لئے فکرمند ہونے کو ابھی میں زندہ ہوں۔ تم اپنی یہ نام نہاد محبت اور فکر اپنے پاس رکھو۔''

''مائنڈ یو مسٹر سالار۔ داجی سے میرا بھی ایک رشتہ ہے جسے آپ بھول رہے ہیں۔'' وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بول اٹھی تھی۔

''اول تو میں ایسے کسی رشتے کو نہیں مانتا۔ مان بھی لوں تو بھی وہ رشتہ داور کے ساتھ ہی ختم ہو چکا ہے۔'' وہ زہر خند ہو رہا تھا۔ تبھی ڈاکٹر نے داجی کی طبیعت سنبھلنے کا مژدہ سنایا تو میرب کے لبوں سے بے ساختہ ''شکر میرے مولا'' کے الفاظ نکلے تھے۔ اسے یوں لگا جیسے وہ پھر سے جی اٹھی ہو۔ سالار کے چہرے پر بھی اطمینان چھلکنے لگا تھا۔

داجی جتنے دن ہسپتال میں رہے' میرب ان کی پٹی سے لگی رہی۔ داجی خفا خفا سے تھے وہ گھر آ گئے تب بھی ان کے رویے میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ میرب سے رہا نہ گیا تو بے اختیار ان کے قدموں میں سر رکھ کر رو دی۔

''داجی' پلیز مجھے معاف کر دیں۔ میں بہت بری ہوں۔ میں نے آپ کا دل دکھایا ہے۔ پلیز داجی' میں......میں اب کبھی بھی آپ کو

چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ میں ہمیشہ آپ کے پاس رہوں گی۔'' وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہی تھی۔ جلال خان بھی آبدیدہ ہو گئے۔ ان کا پرشفیق ہاتھ میرب کے سر پر آ ٹکا تھا۔

''آپ...... آپ نے مجھے معاف کر دیا ناں داجی!'' وہ گویا پھر سے جی اٹھی تھی۔

''میرو...... دیکھا جائے تو داور کے بعد اب میرا تم سے کوئی رشتہ نہیں مگر یہ جو دل ہے نا! یہ کسی نام نہاد رشتے کو نہیں مانتا۔ میں نے تمہیں بیٹی کہا ہی نہیں بیٹی مانا بھی ہے۔ جانتی ہو میری اپنی بیٹی نے جو حرکت کی اس کے بعد میرا دل کسی کو بیٹی ماننے کو تیار نہیں تھا۔ تم نے...... تم نے صحیح معنوں میں بیٹی بن کر دکھایا۔ تم بہت اچھی، بہت پیاری بیٹی ہو۔ ایسی بیٹی جس پر کوئی بھی باپ فخر کر سکتا ہے۔ بہت نصیبوں والے ہوتے ہیں وہ والدین جن کے گھر تم جیسی بیٹیاں جنم لیتی ہیں۔'' وہ رو رہے تھے۔ میرب بھی نم آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ ''میرو، تم جانتی ہو میری بیٹی نے کیا کیا؟ اس نے میرے ماتھے پر کلنک لگا دیا۔ اس نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ میں ایک بدنصیب باپ ہوں۔ مگر تم...... تم نے مجھے باور کروایا کہ میرے حصے کی خوش نصیبی تمہاری صورت میں ابھی میری منتظر ہے۔ یہ گھر تمہارا ہی، اس گھر کو تمہاری ضرورت ہے۔ وعدہ کرو، تم کبھی اس گھر کو چھوڑ کر نہیں جاؤ گی۔'' ایک بوڑھا شخص جس کے لہجے میں بچوں کا سا خوف اور معصومیت تھی، میرب احسان سے عہد لے رہا تھا۔ اپنی بے یقینی اور خوف کو یقین میں ڈھلتے دیکھنا چاہ رہا تھا۔

''داجی...... میں آپ کی بہو نہیں، آپ کی بیٹی ہوں اور میں وعدہ کرتی ہوں، میں آپ کو چھوڑ کر کبھی نہیں جاؤں گی۔''

''چلو اب اسی خوشی میں میرے لئے اپنے ہاتھوں سے اچھا سا کھانا بنا کر لاؤ۔ بہت بھوک لگی ہے۔ کچھ مزیدار سا ہونا چاہئے۔ اتنے دنوں سے یہ پھیکے پھیکے میٹھے کھانے کھا کھا کر جی اوب گیا ہے۔'' داجی نے ہلکی سی چپت اس کے سر پر لگائی تو وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کر کچن کی طرف چلی گئی۔ دروازے کی اوٹ میں کھڑا سالار آفندی فوراً ایک طرف ہوا تھا۔ یہ لڑکی اس کے دادا کے لئے کتنی اہم تھی، یہ اسے پتا چل گیا تھا۔

❀❀❀

''یہ...... یہ تصویر......؟'' وہ گل رانو اور رحمت خان کی بیوی کو ساتھ لگائے اسٹور روم کی صفائی کروا رہی تھی جب سنہرے فریم میں لگی تصویر دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ فریم کا شیشہ گرد سے اٹا تھا۔ اسی طرح کی چند اور تصاویر بھی تھیں جن کے فریم ٹوٹے ہوئے تھے۔ میرب کو وہ چہرہ خاصا جانا پہچانا لگا تھا۔

''یہ کس کی تصویر ہے؟ اس نے گل رانو سے پوچھا۔

''یہ...... یہ پتا نہیں۔ ام کو نہیں پتا۔'' گل رانو نے نفی میں سر ہلایا۔

''یہ تصویر...... بی بی...... یہ واپس رکھ دو۔ کان کو پتا چل گیا تو قیامت آ جائے گا۔'' رحمت خان کی بیوی گھبرا سی گئی تھی۔

''مگر یہ تصویر ہے کس کی؟''

''وہ...... وہ......'' رحمت خان کی بیوی گل زریں متذبذب نظر آ رہی تھی۔

''تم فکر نہ کرو میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔''

''وہ جی...... یہ...... بڑے خان کی بیٹی کی تصویر ہے، زرینہ گل۔''

''زرینہ گل۔'' میرب کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ ''تائی زرینہ، فیضان تایا کی بیوی۔'' وہ بڑبڑائی۔

''بی بی...... آپ......'' زریں گل خوفزدہ سی تھی۔

''تم فکر نہ کرو میں کسی سے ذکر نہیں کروں گی۔'' میرب نے تسلی دی۔ صفائی کروانے کے بعد بھی اس کا ذہن وہیں اٹکا رہا۔ زرینہ تائی کی باتیں یاد آنے لگی تھیں۔ داجی ان سے ناراض تھے اور ہونا بھی چاہئے تھا۔ زرینہ نے حرکت ہی ایسی کی تھی۔ ''اپنے پیاروں کی عزت کو رول دینا کہاں کا انصاف ہے۔ جو لوگ یہ نعرہ لگاتے ہیں کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے، وہ سراسر غلط ہیں۔ کیونکہ یہ نظریہ مغرب کا ہے۔ اسلام ہمیں شدت پسندی کا نہیں اعتدال و میانہ روی کا درس دیتا ہے۔ محبت میں اس حد تک آگے بڑھ جانا کہ اپنے باپ، دادا کی

عزت وناموس خاک میں ملا دینا سراسر زیادتی ہے۔ بے شک بالغ لڑکی کو اپنی پسند کی شادی کا حق دیا گیا ہے' مگر اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔'' داجی ایک لمحے کو خاموش ہوئے۔ اس نے بڑے طریقے سے جھجکتے جھجکتے داجی سے ان کی بیٹی کی بابت دریافت کیا تھا۔

''زرینہ کو ہم نے بڑے نازوں سے پالا تھا۔ شاید ہمارے بے جا لاڈ پیار کا صلہ اس نے اس طرح دیا۔ زرینہ کی منگنی ہمارے چچازاد کے بیٹے سے ہوئی تھی۔ داور تب دس برس کا تھا اور سالار سات برس کا۔ داور کا رشتہ بھی میرے چچازاد کی نواسی پلوشے سے طے تھا' مگر زرینہ کے گھر سے بھاگ جانے کے بعد حالات بہت برے ہو گئے تھے۔ وہ لوگ پلوشے کا رشتہ بھی توڑ رہے تھے مگر میرا چچازاد اڑ گیا۔ اس نے یہ رشتہ برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا۔ بعد کے حالات تمہارے سامنے ہیں۔ کس طرح ان لوگوں نے برسوں پہلے کا بدلہ لینے کے لئے داور کے رشتے سے انکار کیا اور پلوشے' وہ داور سے پیار کرتی تھی' میں جانتا تھا' اس نے خودکشی کرلی۔ معلوم نہیں آج کل کی لڑکیوں کو کیا ہو گیا ہے۔ ایک نے گھر سے بھاگ کر باپ کے شملے کو مٹی میں رول دیا تو دوسری نے خودکشی کر کے باپ دادا کا نام روشن کر دیا مگر سب بیٹیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں' کچھ بیٹیاں اچھی بھی ہوتی ہیں۔ تمہارے جیسی' نیک اور معصوم۔'' جلال خان کا گلا رندھ گیا تھا۔ وہ بہت سخت جان تھے مگر عمر کے اس دور میں آ کر برداشت کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

''داجی...... آپ جانتے ہیں وہ اس وقت کہاں ہیں؟''

''نہیں۔ وہ ہمارے لئے مر چکی ہے۔'' ان کا لہجہ اٹل تھا۔

''داجی...... وہ...... میرے سگے تایا کی بیوی ہیں۔'' اس نے سر جھکا کر مجرمانہ سے انداز میں انکشاف کیا تو جلال خان چونک گئے۔ وہ ایک لمحے کو کچھ نہ بول سکے تھے۔ ''میں نے انہیں کبھی خوش نہیں دیکھا۔ پچھتاؤں کے ناگ ہر لمحہ انہیں ڈستے رہتے ہیں۔ بہت یاد کرتی ہیں وہ آپ کو اور ہر لمحہ آپ سے معافی مانگتی رہتی ہیں۔''

''کیسی...... ہے وہ؟'' داجی کی آواز اور لہجہ رندھ گیا تھا۔

''ویسی...... جیسی ایک گھر سے بھاگی لڑکی کی زندگی ہوتی ہے۔''

''اس نے ہماری عزت مٹی میں ملا دی مگر دل سے کبھی بھی ہم نے اسے بددعا نہیں دی۔ وہ بدنصیب اپنا بویا کاٹ رہی ہے۔''

''خان...... خان...... غضب ہو گیا۔'' اچانک تھوڑا سا شور بلند ہوا اور رحمت خان حواس باختہ سا اندر داخل ہوا۔

''الٰہی خیر۔'' جلال خان نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا تھا۔ میرب بھی گھبرا گئی۔ کسی انہونی کے احساس نے دل کو جکڑ لیا تھا۔ جلال خان کا کمزور دل ایسی کسی بھی خبر کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

''ہوا کیا ہے؟'' میرب کی گھٹی گھٹی سی آواز نکلی تھی۔

''وہ سالار خان......''

''کیا...... کیا ہوا سالار کو؟'' داجی گھبرا گئے تھے۔ میرب بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھی تھی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں رحمت خان کو خاموش رہنے کی تنبیہہ کی۔''

''بولتا کیوں نہیں' کیا ہوا میرے بچے کو؟ کہاں ہے وہ؟''

''خان...... سالار خان کی لڑائی ہو گئی ہے' نوروز اور شمشیر خان کے ساتھ۔'' وہ اٹک اٹک کر بتانے لگا۔

''کیا؟ کہاں ہے وہ؟ ٹھیک ہے نا؟'' جلال خان جیسا جی دار بندہ بھی گھبرا گیا۔ ''میرو...... میرو بیٹا! یہ کیا کہہ رہا ہے؟ سالار ٹھیک تو ہے ناں۔ ہم میں اسے کھونے کا حوصلہ نہیں ہے اب۔'' جلال خان اس سمے خوفزدہ بچے کی مانند لگ رہے تھے۔ میرب نے بڑی مشکل سے خود کو کمپوز کیا۔

''داجی' آپ پریشان نہ ہوں۔ سالار ٹھیک ہوں گے انشاء اللہ۔'' وہ جلال خان کو تسلی دینے کے بعد خود باہر آ گئی۔ تبھی بیرونی دروازے

سے سالار اندر آتا دکھائی دیا۔ چال میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ سر سے کافی خون بہہ رہا تھا اور دایاں بازو بھی شاید زخمی تھا۔ وہ بے دم سا ہو کر قریبی صوفے پر ڈھے گیا۔ اس کے دونوں باڈی گارڈز بھی شدید زخمی تھے۔ ڈرائیور تو موقع پر ہی دم توڑ گیا تھا۔ بڑی مشکل سے سالار ڈرائیو کر کے گھر پہنچا تھا۔ باڈی گارڈز زخمی حالت میں گاڑی میں ہی موجود تھے۔

"سالار......سالار......آپ ٹھیک ہیں نا؟" وہ بے اختیار اس کے قریب جا بیٹھی تھی۔

"میں......مم......میں ٹھیک......آہ......درد سے کراہ نکل گئی تو خود بخود میرب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"رحمت خان، فوراً گاڑی نکالو اور خان کو لے کر آؤ۔" چوکیدار اور رحمت خان کے سہارے وہ گاڑی تک پہنچا تھا۔ میرب نے فرنٹ سیٹ سنبھال لی تھی۔ گل رانو کو داجی کو کچھ نہ بتانے کی تاکید کر کے وہ ہسپتال چلی آئی تھی۔ دونوں باڈی گارڈز میں سے ایک آئی سی یو میں تھا جبکہ دوسرا قدرے بہتر حالت میں تھا۔ سالار کا دایاں بازو فریکچر تھا، ٹانگ پر بھی زخم تھے، گولی چھوتی ہوئی گزر گئی تھی۔ سر پر چوٹ لگی تھی مگر زخم معمولی تھا۔ میڈیکل ایڈ کے بعد اسے وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ چند ضروری ٹیسٹوں کے بعد بازو کے فریکچر کے لئے اسے آپریشن تھیٹر لے جایا گیا۔ میرب کا دل ڈوب رہا تھا۔ اسے اسپتال کے یخ بستہ کاریڈور میں فکرمندی سے ٹہلتی میرب احسان پر اس لمحے یہ کھلا تھا کہ سالار آفندی اپنی تمام تر نفرت کے باوجود اس کے لئے بہت اہم تھا۔ یہ اس پر اب کھلا تھا کہ سالار کے لئے اس کے دل میں یہ خاص مقام کیوں تھا؟ کیوں اس نے کبھی بھی اتنی نفرت اور حقارت کے باوجود بھی سالار سے نفرت نہیں کی تھی۔ دل کے اس انکشاف پر وہ خود بھی خوفزدہ سی ہو گئی۔

"نہیں......یہ غلط ہے۔" وہ خود کو سرزنش کر رہی تھی۔ مختلف سورتوں و آیات کا ورد کرتی وہ سالار آفندی کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ تبھی وہ ٹھٹک گئی۔ کاریڈور کے دوسرے سرے پر داجی کھڑے تھے وہ لپک کر ان تک گئی۔

"داجی......آ......آپ......"

میرو......وہ ٹھیک ہے ناں؟ داور تو بے وفا نکلا مگر سالار، سالار ایسا نہیں ہے وہ قول کا پکا ہے۔ وہ ہمیں چھوڑ کر نہیں جائے گا ناں؟" داجی سخت ہراساں تھے۔ گل رانو کے روکنے کے باوجود بھی وہ رحمت خان کو فون کر کے گھر بلا چکے تھے اور پھر رحمت خان ہی انہیں ہسپتال لے کر آیا تھا۔

"داجی، وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ فکر نہ کریں۔ آئیں ادھر بیٹھتے ہیں۔" اس نے لہجے کو بشاش بنایا اور داجی کا ہاتھ تھام کر کاریڈور میں رکھے صوفے پر بیٹھ گئی۔

سالار کو روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ فی الحال وہ استھزایا کے زیر اثر تھا۔ چہرے پر زردیاں کھنڈی تھیں۔ جانے کتنا خون ضائع ہو گیا تھا۔ سر، بازو پر، سینے پر اور بائیں ٹانگ پر پٹیاں بندھی تھیں۔ خوبرو جوان پوتے کو اس حالت میں دیکھ کر جلال خان کا دل کٹنے لگا تھا۔ وہ کافی دیر ایک ٹک اسے بیٹھے دیکھتے رہے۔ میرب کے بارہا کہنے پر بھی وہ گھر جانے پر راضی نہیں ہوئے تھے۔

"سالار......سالار......بیٹا آنکھیں کھولو۔" سالار کی پلکوں میں معمولی سی جنبش ہوئی تو جلال خان گویا پھر سے جی اٹھے۔ وہ ذرا سا کسمسا کر پھر سے خاموش ہو گیا۔ ہسپتال میں صرف ایک بندے کو رکنے کی اجازت تھی۔ داجی گھر چلے گئے تھے اور سالار کے پاس میرب رک گئی تھی۔ رحمت خان گاڑی لئے باہر ہی موجود تھا۔ سالار نیم بے ہوش تھا۔ ڈیوٹی نرس اور ڈاکٹر دوبارہ آ کر دیکھ چکے تھے۔

"تم اس طرح لیٹے ہوئے بالکل اچھے نہیں لگتے۔ تم پر تو صرف ایک ہی روپ سجتا ہے، اکھڑ اور مغرور سا۔ ہر وقت غصے سے پھنکارتا ہوا۔ نوکروں کے لئے دہشت کی علامت اور میرے لئے......میرے لئے تم کیا ہو، یہ تو میں خود سے بھی چھپانا چاہتی ہوں۔ جانتی ہوں تم مجھ سے بے پناہ نفرت کرتے ہو، داور کی موت کا ذمہ دار مجھے سمجھتے ہو مگر میں پھر بھی تم سے کبھی نفرت نہیں کر سکی۔ سالار آفندی، میں نے کبھی خواب نہیں دیکھے کیونکہ جانتی ہوں میرے خوابوں کی کوئی تعبیر ہی نہیں ہے اور تم......تم میرا وہ خواب ہو جو میں بند آنکھوں سے کیا کھلی آنکھوں سے بھی نہیں دیکھ سکتی۔" رات کے اس پہر وہ تنہا بیٹھی خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑا رہی تھی۔ سالار کے سرہانے ہی اس کی کرسی موجود تھی۔ وہ نیم

بے ہوش تھا' اس لئے میرب کو اس بات کا ڈر نہیں تھا کہ وہ اس کی باتیں سن رہا ہوگا۔ دل کا غبار کسی طرح تو نکالنا تھا ناں۔

ایک ہفتہ ہسپتال میں رہنے کے بعد وہ گھر آ گیا تھا۔ جب تک وہ ہسپتال میں رہا' میرب اس کی تیمارداری کرتی رہی مگر رات کو وہ اپنے پاس رحمت خان کو روک لیا کرتا تھا۔ گھر آ کر بھی وہ خاصا خاموش خاموش سا تھا۔ پہلے کی طرح میرب کو دیکھ کر نفرت سے منہ نہیں موڑتا تھا۔ بس لاتعلق سا رہتا تھا۔ میرب اس تبدیلی کو اس کی طبیعت سے محمول کرتی رہی۔ داجی کا سارا وقت عموماً سالار کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ سالار کے باقی زخم تو مندمل ہو گئے تھے مگر بازو پر ابھی پلاسٹر چڑھا تھا۔ دایاں ہاتھ تھا تو کھانے میں بھی مسئلہ ہوتا تھا۔ اس لئے زیادہ تر داجی اسے اپنے ہاتھ سے کھلایا کرتے تھے۔ اس روز رات کے کھانے پر میرب بھی وہاں موجود تھی' داجی کے کہنے پر کھانا سالار کے کمرے میں لگایا گیا تھا اور داجی نے زبردستی میرب کو بھی وہاں روک لیا تھا۔ ناچار اسے بیٹھنا پڑا تھا حالانکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ سالار اس کا اپنے بیڈروم میں آنا پسند نہیں کرتا تھا۔

''داجی...... میں خود کھا لوں گا۔'' شاید وہ میرب کی موجودگی کی وجہ سے تکلف محسوس کر رہا تھا۔

''تم تو یوں جھجک رہے ہو جیسے پہلی بار میرے ہاتھ سے کھانا کھا رہے ہو۔ برخوردار انہی ہاتھوں سے نوالے بنا بنا کر تم دونوں کو کھلایا کرتا تھا' آج جوان ہو گئے تو نخرے دکھا رہے ہو۔ چلو' منہ کھولو۔'' داجی کے دھونس بھرے انداز پر وہ دھیرے سے مسکرایا۔

''یہ شخص مسکراتے ہوئے کتنا اچھا لگتا ہے۔'' میرب نے ایک لمحے کو اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ اسی پل سالار کی نظریں اس سے ملیں تو وہ ٹپٹا کر نظریں جھکا گئی۔ کھانے کے بعد گل رانو برتن سمیٹ رہی تھی جب بالکل غیر متوقع طور پر اس نے سالار کو کہتے سنا۔

''گرین ٹی ملے گی؟'' سالار آفندی اور اتنا نرم لہجہ! پہلے وہ سمجھی کہ اس نے گل رانو سے کہا ہے۔

''گرین ٹی ملے گی؟'' اس کے دوبارہ کہنے پر میرب نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ اسی جانب دیکھ رہا تھا۔ میرب کے لئے تو یہ مقام حیرت تھا ہی داجی بھی خوشگوار سی حیرت میں گھر گئے تھے۔ پہلی بار وہ براہ راست میرب سے مخاطب تھا اور وہ بھی اتنے نرم انداز میں۔

''جی...... میں بناتی ہوں۔'' وہ حیرت کے جھٹکوں سے نکلی تو اٹھ کر کچن کی جانب چلی گئی۔

''لگتا ہے اس حادثے میں سالار آفندی کی یادداشت بھی متاثر ہوئی ہے۔'' وہ بس سوچ کر رہ گئی۔ چائے لے کر اندر گئی تو دونوں دادا اور پوتا کسی بات پر مسکرا رہے تھے۔ اسے دیکھ کر سالار کی ہنسی یکلخت تھمی تو وہ خود کو مس فٹ محسوس کرتے ہوئے اپنا کپ لے کر کمرے سے باہر چلی آئی۔

❋❋❋

''السلام علیکم! کیسی ہیں آپ؟'' وہ اپنی مخصوص جگہ پر آج کافی دنوں کے بعد بیٹھی تھی۔ ڈوبتے سورج کو دیکھنا اس کا پسندیدہ مشغلہ جو تھا۔

''آ...... آپ؟'' صارم رضا کو وہاں دیکھ کر وہ چونک گئی تھی۔ ''آپ کب آئے؟''

''دو گھنٹے پہلے۔ سالار کے حادثے کا یہیں آ کر پتا چلا۔'' پہلے کی نسبت وہ خاصا سنجیدہ اور ریزروسا لگ رہا تھا۔ شاید وہ اسے داور کی بیوہ سمجھ کر عزت دے رہا تھا۔ وہ محض ایک گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

''میری والدہ اور بھابی بھی میرے ساتھ آئی ہیں۔ داجی کے پاس بیٹھی ہیں۔ آپ کا پوچھا تو داجی نے کہا شاید آپ سو رہی ہیں مگر میں جانتا تھا آپ یہاں موجود ہوں گی۔'' بایاں ہاتھ جینز کی پاکٹ میں ڈالتے ہوئے وہ پہلی بار دھیمے سے مسکرایا تھا۔ گہری نگاہیں میرب پر جمی تھیں۔

''میں...... اندر جاتی ہوں۔'' وہ جانے کیوں وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ حالانکہ اس کے دل میں چور نہیں تھا وہ صارم رضا میں انٹرسٹڈ نہیں تھی اور نہ ہی کبھی ہو سکتی تھی۔ دل تو...... دیوانہ تھا کھیلن کو چاند مانگ بیٹھا تھا۔ جو اس کے بس میں نہیں تھا۔

جس کا ملنا دشوار بہت ہے
مجھے اس شخص کا انتظار بہت ہے

خواب جو مجھے اس سے ملا دیں

ان خوابوں سے مجھے پیار بہت ہے

ذہن کی پرواز جانے کہاں تک چلی گئی تھی۔ وہ دھیرے سے مسکرائی۔ صارم کی موجودگی یکسر فراموش کر بیٹھی تھی۔ تبھی نظر سامنے اٹھی تو گویا پلٹنا بھول گئی۔ سالار خان خاصی خشمگیں نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ صارم خان کی اس کی جانب پشت تھی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بوکھلا گئی۔

وہ جس خاموشی سے آیا تھا اسی خاموشی سے واپس بھی پلٹ گیا مگر میرب احسان کے دل کی دنیا تہہ و بالا کر گیا۔ وہ بوکھلائی بوکھلائی سی اندر کی جانب بڑھ گئی۔ صارم کی والدہ اور بھابی بڑی شفقت سے ملی تھیں۔ والدہ کا رویہ تھوڑا کھنچا کھنچا سا تھا۔ جسے وہ صحیح طرح سے محسوس بھی نہ کر پائی تھی۔ داجی کے کہنے پر وہ کھانا لگوانے چلی گئی تھی۔ کھانا وغیرہ کھا کر وہ لوگ روانہ ہوئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد سے جلال خان گہری سوچ میں گم تھے۔

''سالار مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔'' وہ متفکر اور پرسوچ سے انداز میں بول رہے تھے۔

''داجی، مجھے بلا لیا ہوتا' آپ نے کیوں تکلیف کی؟'' وہ تعظیماً اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''جب کسی سے کوئی درخواست کرنی ہو تو خود چل کر آنا پڑتا ہے برخوردار۔'' وہ تھکے تھکے سے لہجے میں کہتے صوفے پر ٹک گئے۔

''کیسی باتیں کر رہے ہیں داجی! آپ حکم کیجئے۔''

''تو سنو!'' وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔

شب ہجراں کی اذیت کی خبر کس کو ہے

میری گمنام محبت کی خبر کس کو ہے

کس کو احساس میری شدت جذبات کا ہے

میری حالت' میری وحشت کی خبر کس کو ہے

کون ویران مکانوں کی خبر رکھتا ہے

میری اجڑی ہوئی قسمت کی خبر کس کو ہے

میں نے چپ چاپ محبت کے ستم جھیلے ہیں

میری اس بے پناہ محبت کی خبر کس کو ہے

''یہ غیر اخلاقی حرکت ہے سالار آفندی۔'' میرب نے ڈائری اس کے ہاتھ سے جھپٹ لی۔

''آئی ایم سوری مگر اپنے پرسنلز کو اپنے روم تک محدود رکھا کیجئے۔'' خاصا تند و تیز سا لہجہ تھا۔ وہ یونہی لاؤنج میں چلا آیا تھا جب نظر سینٹر ٹیبل پر پڑی سیاہ جلد والی ڈائری پر پڑی جو کھلی پڑی تھی اور بال پوائنٹ اس پر رکھا تھا۔ وہ یونہی اس میں لکھی شاعری پڑھنے لگا تھا۔ میرب اپنے لئے چائے بنانے کچن تک آئی تھی اور شومئی قسمت ڈائری لکھتے لکھتے وہیں کھلی چھوڑ گئی۔ رات کے اس پہر سالار خان جاگ رہا ہو گا یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

''افسوس کہ آپ کی یہ ''گمنام محبت'' گمنام ہی رہے گی۔'' سالار کے کہنے پر اس نے الجھ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

''میں جانتی ہوں۔'' وہ گویا بڑبڑائی تھی مگر سالار نے سن لیا۔

''یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم داور کی بیوہ ہو' تم نے صارم کی حوصلہ افزائی کیوں کی؟'' وہ اس کی راہ میں حائل ہو گیا تھا۔ ایک لمحے کو تو وہ کچھ سمجھ ہی نہ پائی تھی۔

"کیا مطلب؟"

"اتنی معصوم نہیں ہو جتنی بن رہی ہو۔"

"سالار خان کھل کر بات کریں۔ پہیلیاں مت بجھوائیں۔"

"صارم نے تمہارے لئے اپنا پروپوزل دیا ہے کیا میں پوچھ سکتا ہوں تم نے اسے اجازت کیوں دی؟ کہاں گئے وہ دعوے کہ تمام عمر داور کے نام پر بتادو گی۔ کہاں گئے وہ وعدے وہ جھوٹی تسلیاں جو تم اب تک داجی کو دیتی آرہی تھیں کہ ان کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤ گی۔" اس کی طرف بڑھتے ہوئے وہ بول رہا تھا اور میرب پیچھے کو ہٹتے ہٹتے دیوار سے جا لگی تھی۔

"بولو! میرب احسان' جواب دو۔" دائیں بائیں دونوں ہاتھ دیوار پر ٹکا دیئے یوں کہ وہ بالکل اس کے حصار میں آگئی۔ اس کی زندگی میں تین مرد آئے تھے۔ مہران شاہ' داور خان اور صارم رضا' وہ کسی سے بھی محبت نہ کر سکی تھی۔ حتیٰ کہ نکاح کے بعد بھی اسے داور خان سے محبت نہیں ہو سکی تھی۔ ہاں وہ اس کی عزت ضرور کرتی تھی کہ وہ اس کی عزت کا رکھوالا ثابت ہوا تھا۔ شاید وہ اس سے محبت بھی کرتی اگر شادی ہو جاتی...... مگر...... وائے قسمت کہ محبت ہوئی بھی تو کس سے؟ اس شخص سے جو شاید اس دنیا میں اس سے سب سے زیادہ نفرت کرتا تھا اس کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ میرب کو پتا بھی نہ چلا اور آنسو اس کے گال بھگوتے چلے گئے۔

"جانتا ہوں' یہ آنسو عورت کا سب سے مضبوط ہتھیار ہوتے ہیں مگر تم...... تم جیسی عورتیں......"

"مجھ جیسی عورتیں؟ کیسی عورت ہوں میں؟ کیا کیا ہے میں نے؟ آخر کیا بگاڑا ہے میں نے آپ کا؟" وہ تڑپ کر اس کے حصار سے نکلی تھی۔ "جانتی ہوں آپ مجھ سے نفرت کرتے ہیں' مگر کیوں کرتے ہیں؟ یہ جاننے کا حق تو ہے ناں مجھے۔ مجھ میں کونسی خرابی دیکھ لی ہے آپ نے؟ میرے کردار پر آپ کو شک ہے' مجھ سے بے پناہ نفرت ہے' آپ کے خیال میں داور خان کو میں نے پھنسایا یا انہیں مجبور کیا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ بھگا کر لے آئیں؟ یا داور خان میری وجہ سے مر گئے؟ آج آپ مجھے ایک بار میرے تمام قصور بتا دیجئے۔ میر خطائیں جن کی وجہ سے میں معتوب و قابل نفرین ٹھہری۔ رہی بات صارم رضا کی' تو میں نہیں جانتی اس نے ایسا کیوں کیا؟ ویسے آپ کو تکلیف کیوں ہو رہی ہے؟ آپ تو خود چاہتے ہیں ناں کہ میں اس گھر سے چلی جاؤں تو پھر چاہے وہ صارم رضا ہو یا کوئی ایکس وائی زیڈ' آپ کو اس سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہئے۔" وہ بولنے پر آئی تو بولتی چلی گئی۔

"اول تو میں نہیں جانتی صارم رضا نے میرے لئے اپنا رشتہ کیوں بھجوایا' اگر ایسا ہے تو ٹھیک ہے مجھے یہ رشتہ منظور ہے۔" وہ پلٹی تو ایک لمحے کو ساکت رہ گئی۔ جلال خان وہاں موجود تھے۔ وہ کب سے وہاں کھڑے تھے۔ یہ وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ اپنے آنسوؤں کو پونچھتی خاموشی سے وہاں سے چلی گئی۔ جلال خان اور سالار آفندی ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔

"تو پھر تم نے کیا سوچا ہے؟" جامد خاموشی کو جلال خان کی بھاری آواز نے توڑا تھا۔ سالار خان نے ایک نظر سامنے میز پر رکھی سیاہ جلد والی ڈائری پر ڈالی۔

"ٹھیک ہے داجی' آپ صارم کی والدہ سے خود ہی مناسب طریقے سے بات کر لیجئے گا۔" وہ تھکے تھکے سے انداز میں کہتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

❁❁❁

رات آنکھوں میں کٹی تھی مگر وہ بالکل نہیں روئی تھی۔ آنکھیں بالکل خشک تھیں کیونکہ وہ اب تک اتنا رو چکی تھی کہ اب تو آنسو بھی بیزار ہو کر کب کا اس سے دامن چھڑا کر جا چکے تھے۔ نماز پڑھنے کے بعد کتنی ہی دیر وہ قرآن پاک کی تلاوت کرتی رہی پو پھوٹنے لگی پھر سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمکنے لگا۔ وہ تب بھی اپنے کمرے میں بند رہی۔

"بی بی......" گل رانو نے دروازہ بجا کر دھیرے سے پکارا تھا۔

"آجاؤ۔" اس نے قرآن پاک کو غلاف میں لپیٹ کر آنکھوں سے لگایا۔

''بی بی' وہ بڑے خان......''

''کیا ہوا داجی کو؟'' وہ گھبرا گئی۔

''وہ جی کچھ نہیں کھا رہے' چھوٹے خان کو بھی ڈانٹا ہے۔''

''اوہ'' وہ تاسف میں گھر گئی۔ روزانہ داجی کو ناشتہ دینا اور ساتھ ساتھ اخبار پڑھ کر سنانا اس کا معمول تھا۔ آج جانے یہ سب کیوں بھول گئی تھی۔ وہ شرمندہ شرمندہ سی ان کے کمرے میں داخل ہوئی' تو وہاں سالار خان ہاتھ میں سوپ کا پیالہ لئے داجی کی منتیں کرتا نظر آیا۔

''مجھے دیجئے۔'' اس نے بنا کچھ کہے سنے سالار کے ہاتھ سے پیالہ لے لیا۔ ''گل رانو' اخبار لاؤ آج کا۔'' وہ اب ان کے قریب بیٹھ گئی۔ سالار اٹھ کر سامنے رکھی کرسی پر جا بیٹھا تھا اس نے دیکھا کس طرح داجی نے بنا کسی حیل وحجت کے میرب کے ہاتھ سے نہ صرف وہ سارا سوپ پی لیا تھا بلکہ دوا بھی لے لی تھی۔ میرب اب انہیں اخبار پڑھ کر سنا رہی تھی اور داجی ملکی حالات پر تبصرے کر رہے تھے۔

''داجی میں چلتا ہوں اب۔'' سالار کچھ مطمئن سا ہو کر وہاں سے نکل آیا۔ نکلتے نکلتے ایک اچٹتی سی نظر میرب احسان پر ڈالی جو پوری طرح اخبار کی طرف متوجہ تھی۔

''شام تک سارا بندوبست ہو جانا چاہئے۔'' جلال خان نے سالار سے کہا تھا جس پر وہ سر ہلا کر باہر نکل گیا تھا۔

''میرو بیٹا' کیا مجھے اتنا اختیار ہے کہ میں ایک باپ بن کر تمہاری زندگی کا فیصلہ کر سکوں۔''

''داجی' ایسا کہہ کر آپ نے مجھے ایک پل میں پرایا کر دیا۔ آپ کا ہر فیصلہ سر آنکھوں پر۔''

''جیتی رہو۔ تم نے مجھے اتنا مان دے کر میرا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔'' فرط جذبات میں داجی نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا تو اس کی آنکھوں میں نمی سی اتر آئی۔

''آج شام کو تمہارا نکاح ہے۔'' داجی کے کہنے پر وہ چونکی نہ حیرت میں مبتلا ہوئی۔

''تو تم جیت گئے سالار آفندی' تمہاری نفرت جیت گئی اور میری محبت ہار گئی۔ تم نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ میری یہ محبت ہمیشہ گمنام ہی رہے گی اور میں اس گمنام محبت کی مرقد کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے دل کے کسی کونے میں گم کر دوں گی تاکہ صارم رضا تک اس کی آنچ بھی نہ پہنچے اور میں پوری ایمانداری سے یہ نیا رشتہ نبھا سکوں۔ اس نے آنکھوں میں امڈ آنے والے آنسوؤں کو حلق میں اتار دیا تھا۔

❁❁❁

اس کی آنکھ کھلی تو کافی دیر وہ چکراتے سر کے ساتھ چت لیٹی رہی۔ کمرے میں زیرو پاور کے بلب کی مدھم سی روشنی تھی۔ ایک لمحے کو تو وہ خالی الذہنی کی کیفیت میں بیٹھی رہی۔ کشادہ سا بیڈ روم جس کے وسط میں پڑے جہازی سائز بیڈ کے ایک کونے پر وہ لیٹی تھی۔ گہرے سبز دبیز پردے اور میچنگ کارپٹ آف وائٹ صوفہ اور بیڈ' اس کا سر بھاری بھاری ہو رہا تھا۔

''میں کہاں ہوں؟'' اس نے ذہن پر زور ڈالنے کی کوشش کی۔ اسے یاد آیا وہ صبح سویرے حسب معمول واک کے لئے نکلی تھی۔ سب سو رہے تھے' داجی بھی خلاف معمول فجر کی نماز کے بعد دوبارہ سو گئے تھے۔ شام کو نکاح کی چھوٹی سی تقریب تھی اور اگلی صبح یہ حادثہ ہو گیا۔ حادثہ؟ میرب کی حسیات ایک ایک کر کے بیدار ہونے لگی تھیں۔ وہ واک کرتے کرتے کافی دور نکل گئی تھی۔ جب اچانک نیلی پجارو اس کے قریب رکی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتی' اس کے منہ پر رومال رکھ دیا گیا تھا۔ اس کے بعد اسے کوئی ہوش نہیں رہا تھا۔

وہ بمشکل تمام چکراتے سر کو تھام کر اٹھ کر کھڑکی تک گئی تھی۔ پردے ہٹائے تو باہر ڈھلتی شام کا منظر تھا۔ وہ شاید اوپری منزل پر تھی۔ گیٹ پر دو مسلح پہرے دار تھے۔

''یا اللہ! میں کہاں ہوں؟'' وہ دھک سے رہ گئی تھی۔ دفعتاً! وال کلاک نے شام کے سات بجنے کا اعلان کیا۔ صبح چھ بجے وہ گھر سے نکلی تھی۔ ''اوہ میرے اللہ' مجھے گھر سے نکلے ہوئے بارہ گھنٹے ہونے والے ہیں۔ داجی کتنے پریشان ہوں گے۔'' اسے دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ تبھی کلک کی آواز سماعتوں میں ٹکرائی تو وہ چونک کر پلٹی۔ دروازہ کھول کر اندر آنے والا شخص میرب کے اوسان خطا کر گیا۔ خوف' حیرت

کے ملے جلے تاثرات میں گھری وہ گنگ رہ گئی۔

''میں نے کہا تھا ناں کہ مرتے دم تک تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔'' وہ اس کے مقابل آ کھڑا ہوا تھا۔ ''ویسے ایک بات تو ماننی پڑے گی کہ تم بزدل نہیں ہو' جبھی اتنی جرات سے ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر فرار ہوگئیں۔'' بولتے بولتے اس کے لہجے میں خون اتر آیا تھا۔ میرب نے اس لمحے خود کو بے بسی کی انتہا پر محسوس کیا۔

''تم نے سوچا تھا اس طرح بھاگ کر تم مہران شاہ سے جان چھڑا لوگی' تو تم غلطی پر تھیں سویٹ ہارٹ۔'' مہران شاہ نے اس کے چہرے کو بائیں ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

''ڈونٹ ٹچ می۔'' میرب نے اس کا ہاتھ پرے کیا۔

''کیوں؟ میرے چھونے پر اتنی تکلیف کیوں؟ جس کے ساتھ بھاگی تھیں......''

''شٹ اپ' بند کرو یہ بیہودہ بکواس۔'' وہ چلائی۔

''اوہ...... بڑی لمبی زبان ہوگئی ہے۔'' مہران شاہ نے اسے گھورا۔

''مگر مہران شاہ کو ایسی لمبی زبانیں گدی سے کھینچ لینا بھی آتا ہے۔'' مہران نے اس کے بالوں کو جکڑ کر پیچھے کی طرف جھٹکا دیا۔ ''جی تو کرتا ہے تجھے یہیں زندہ گاڑ دوں مگر نہیں...... ابھی تو تجھ سے کچھ حساب کتاب بھی چکتا کرنا ہے۔'' وہ خباثت سے مسکرایا تو میرب جی جان سے لرز کر رہ گئی۔ مہران شاہ اس پر جھکا' اس کی سانسوں کی تپش میرب کے چہرے کو جھلسائے دے رہی تھی۔ تبھی اس کا موبائل بج اٹھا۔ وہ چونک کر دور ہٹا' میرب کو دھکا دینے کے انداز میں بیڈ پر گرا دیا اور خود فون سننے لگا۔

''جی بابا سائیں' یہیں ہے۔'' دوسری طرف یقیناً سبحان شاہ تھے۔ ''مگر...... اتنی جلدی...... ابھی تو...... جی بہتر...... میں آتا ہوں۔''

فون بند کر کے وہ اس کی طرف پلٹا ''چلو میرے ساتھ۔'' بازو سے پکڑ کر تقریباً گھسیٹنے والے انداز میں وہ اسے لے کر باہر نکلا تھا۔ مہران شاہ اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ شمالی علاقہ جات کی سیر کو گیا تھا۔ واپسی پر ایبٹ آباد میں کسی کام سے ایک دو دن ٹھہرنا پڑا تھا۔ اور تب اس کی نظر میرب پر پڑی تھی' تنہا' سوچوں میں گم وہ صبح سویرے سڑک کے کنارے چلی آ رہی تھی۔ مہران شاہ نے لمحوں میں فیصلہ کیا تھا۔ میرب کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ جس کی تلاش میں وہ گزشتہ ڈیڑھ سال سے خوار ہو رہا تھا۔ قدرت نے خود بخود اسے اس کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ سبحان شاہ کی دلچسپی میرب سے زیادہ جائداد کے اس بڑے حصے میں تھی جو میرب کے نام تھا۔ احسان شاہ کی وصیت کے مطابق ان کی ساری جائداد کی وارث میرب اور بعد میں اس کی اولاد ہوگی۔ خدانخواستہ میرب کے انتقال کی صورت میں جبکہ اس کی کوئی اولاد نہ ہو یا شادی نہ ہوئی ہو' تو ساری جائداد ٹرسٹ کو دے دی جائے گی۔ احسان شاہ نے بہت پہلے ہی یہ وصیت تیار کروادی تھی۔ شاید وہ اپنے بڑے بھائیوں کی فطرت سے بخوبی واقف تھے۔ صرف اسی وجہ سے سبحان شاہ میرب کو زندہ تلاش کر رہے تھے تاکہ جائداد کے کاغذات پر اس کے دستخط کروائے جاسکیں اور کاری کرنے کا ڈرامہ تو محض لوگوں کی زبانیں بند کرنے کے لئے رچایا جا رہا تھا۔

میرب کو حویلی کے تہہ خانے میں قید کر دیا گیا تھا۔ حویلی میں سب کو میرب کے آنے کی خبر ہو چکی تھی۔ مگر کسی کو بھی اس سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ ''یا اللہ! ہر بار میرے ساتھ ہی ایسا کیوں؟ خوشیاں میرے دروازے پر دستک دیتے ہی واپس لوٹ جاتی ہیں۔'' رو رو کر اس کا برا حال تھا۔ ابھی تو خوشیوں بھری زندگی کی راہ پر پہلا قدم ہی رکھا تھا کہ......

کسی سے پیار کرتا ہوں تو ہمیشہ ہار جاتا ہوں
میں جتنی بار کرتا ہوں ہمیشہ ہار جاتا ہوں
کبھی کسی محفل میں وفا کی گفتگو پر جب
تکرار کرتا ہوں تو ہمیشہ ہار جاتا ہوں
کہ شاید اس دفعہ کوئی مجھے اپنا بنالے

ہمیشہ پیار کرتا ہوں ہمیشہ ہار جاتا ہوں

ابھی ابھی تو اس دشمن جاں نے اسے قبول کیا تھا......

ابھی تو اس نے مسکرانا سیکھا تھا......

ابھی تو اسے دل کا حال بھی سنانا تھا......

ابھی تو اسے اپنی محبت کا یقین بھی دلانا تھا۔

ابھی تو نفرت کے پودے کو جڑ سے اکھاڑنا بھی تھا۔

ابھی تو......

کتنا کچھ کرنا تھا' ابھی تو سب کچھ ویسے ہی پڑا تھا۔ نامکمل اور ادھورا! تو کیا میں واقعی میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی حاصل کرنے سے پہلے ہی اس سے محروم کر دی گئی ہوں؟ سوچیں' سوچیں' سوچیں...... ہر طرف ایک ہی چہرہ...... ہر طرف اسی کی تصویر......اسے لگا وہ پاگل ہو جائے گی یا اسی عقوبت خانے میں جان کی بازی ہار جائے گی۔ رات سے لے کر اگلے دن دوپہر تک وہ سجدے میں گری زار و قطار روتی رہی تھی۔ مہران شاہ نے اسے لا کر یہاں قید کر دیا تھا۔ سبحان شاہ یا فیضان شاہ میں سے ابھی کوئی یہاں نہیں آیا تھا۔ رات کے کسی پہر کھٹکا سا ہوا تو وہ چونکی' زرد بلب کی ملگجی سی روشنی میں ایک سایہ دھیرے دھیرے چلتا اس تک آیا تھا۔ میرب نے نظر اٹھا کر دیکھا تو بمشکل خود کو کچھ کہنے سے روکا تھا۔

''تا......تائی جان۔'' نیم مردہ وجود میں جان سی پڑنے لگی تھی۔

''میرب' میری جان......تم......تم دوبارہ کیسے آ گئیں۔'' زرمینہ نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

''تائی جان......میں بہت بدقسمت ہوں' بہت زیادہ......وہ رو دی تھی۔

''تم تھیں کہاں؟ تم نے تو کہا تھا اپنے ماموں کے پاس دبئی چلی جاؤ گی پھر یہاں کیسے؟''

''ماموں کا پرانا نمبر میرے پاس تھا' مگر وہاں رابطہ کرنے پر پتا چلا کہ وہ تو کب کے سب کچھ بیچ کر کسی دوسرے ملک شفٹ ہو گئے تھے۔''

''تو پھر تم کہاں رہیں؟''

''قسمت نے مجھے جہاں پہنچا دیا تھا' وہاں رہتے ہوئے میں خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھنے لگی تھی۔ جانتی ہیں وہاں مجھے سب کچھ ملا' عزت' محبت' وقار' جینے کی امنگ' باپ جیسی شفقت اور......اور......'' وہ ایک بار پھر رو دی تھی۔

''تو تم مہران شاہ کو کہاں سے مل گئیں؟''

''تائی جان......بدقسمتی کبھی بتا کر تھوڑا آتی ہے۔'' ایک سرد آہ لبوں سے خارج ہوئی۔ وہ کل سے بھوکی تھی مگر بھوک کا احساس ہی گویا مر گیا تھا۔ پانی کو ترسے لب خشک ہو رہے تھے۔ جن پر وہ بار بار زبان پھیر رہی تھی۔ زرمینہ نے دیکھا کھانا جوں کا توں رکھا تھا۔

''میری جان......اس طرح بھوکے رہ کر تم ان لوگوں کا مقابلہ کیسے کر پاؤ گی؟ کچھ کھا لو۔''

''تھوڑا سا لے لو میری جان۔ شاباش منہ کھولو۔'' زرمینہ لقمے بنا بنا کر اس کے منہ میں دینے لگیں اور وہ چپ چاپ کھائے گئی۔

''تائی جان......آپ مجھ سے اتنی محبت کیوں کرتی ہیں؟'' کھانے سے فارغ ہو کر اس نے پوچھا تو زرمینہ دھیرے سے مسکرا دیں۔

''پتہ نہیں بس شروع سے ہی تمہیں دیکھ کر مجھے پیار آتا تھا۔''

''میں بتاؤں کیوں؟''

''بتاؤ''

''آپ جانتی ہیں میں اتنے دن کہاں رہی؟ مجھے کس شخص کے ساتھ دیکھ کر قتل کرنے کا شور مچایا گیا؟ داور آفندی! جلال خان آفندی کا پوتا اور یاور آفندی کا بیٹا' اور آپ کا سگا بھتیجا۔''

''تت......تم......'' ایک لمحے کو زرینہ گنگ رہ گئیں۔

''ہاں تائی جان' میرے سر پر دست شفقت رکھنے والے داجی' آپ کے داجی۔''

''کیسے...... ہیں وہ؟'' کافی دیر بعد زرینہ بولنے کے قابل ہوئیں۔ آنکھوں سے سیل رواں ہو گیا۔

''پے در پے صدمات نے انہیں کافی کمزور کر دیا ہے۔ پہلے بیٹا اور بہو' پھر آپ اور پھر...... پھر داور......''

''کیا...... کیا کہہ رہی ہو؟ کیا ہوا داور کو؟'' زرینہ کو لگا ان کا دل پھٹ جائے گا۔ ان کا وہ گل گوتھنا سا' سرخ و سپید بھتیجا' انہیں بہت پیارا تھا۔ وہ چھ برس کا تھا اور سالار چار برس کا جب وہ فیضان شاہ کے ساتھ وہاں سے بھاگ کر آئی تھیں اور اپنی اس ایک غلطی کا خمیازہ اب تک بھگت رہی تھیں۔

''ان نام نہاد غیرت مندوں نے اس معصوم شخص کو مار ڈالا۔ وہ بہت اچھے انسان تھے۔ بہت پیار کرنے والے' عزت کرنے والے۔'' داور کا ذکر وہ بڑی عقیدت سے کر رہی تھی۔

''نہیں...... دور......'' زرینہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھیں۔ کافی دیر وہ دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ کر روتی رہی تھیں۔ جانے کون کون سے دکھ ان کے دلوں میں تھے جو آنسو بن کر بہہ رہے تھے۔

''تائی جان...... مجھے کسی طرح یہاں سے نکالئے۔ پلیز تائی جان۔''

''میرب...... میری جان' تم فکر نہ کرو' میرے بس میں جو ہوا میں کروں گی۔ میرے میکے کی عزت ہو تم۔ تمہاری حفاظت میں اپنی جان پر کھیل کر بھی کروں گی۔ بس تم کسی پر ظاہر نہ ہونے دینا کہ تمہارا میرے میکے والوں سے کوئی تعلق ہے۔''

''تائی جان...... آپ...... آپ پلیز سالار کو کسی طرح یہاں کا پتا...... نہیں نہیں...... وہ یہاں آیا تو یہ لوگ اسے بھی...... نہیں نہیں......'' وہ خوفزدہ سی ہو کر اپنی ہی بات کی نفی کرنے لگی۔

''سالار بہت ہوشیار بچہ ہے' تم مجھے اس کا فون نمبر دو۔ میں طریقے سے اسے بتاؤں گی۔''

''تائی جان اگر کسی کو پتا چل گیا کہ آپ میرے پاس......'' اس کا دل واہموں اور خدشات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

''کچھ نہیں ہوتا۔ مردوں میں سے اس وقت گھر پر کوئی نہیں ہے۔ بھابی شہر بانو بھی اپنے بھائی کے گھر گئی ہوئی ہیں۔ رہے ملازم' تو انہیں خاموش کروانا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ تم مجھے نمبر بتاؤ۔'' میرب نے انہیں سالار کے دونوں نمبر بتا دیئے۔ زرینہ اس کے لئے اندھیرے میں روشنی کی کرن بن کر آئی تھیں۔

❀❀❀

''آپ تہہ خانے میں کیا کر رہی تھیں؟'' زرینہ اوپر آئیں تو مہران شاہ سے ٹاکرا ہو گیا۔ اس کا لہجہ تند و تیز سا تھا۔ زرینہ ایک لمحے کو گھبرا سی گئی پر دوسرے ہی لمحے خود پر قابو پا لیا۔

''سکھاں (ملازمہ) بتا رہی تھی میرب کھانا نہیں کھا رہی۔ میں نے کہا خود جا کر زبردستی کچھ کھلاؤں۔ کہیں مر مرا گئی تو ہمارا تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔''

''اوہ...... اچھا...... تو پھر کچھ کھایا اس نے؟''

''ہاں...... بڑی مشکل سے چند لقمے لئے ہیں۔ بس اب جلد ہی کوئی فیصلہ کر لو۔ کیوں رکھا ہوا ہے اسے ابھی تک یہاں۔''

''تائی اماں' بس آج کی رات' کل صبح جرگے کے سامنے اسے قتل کر دیا جائے گا۔'' وہ مونچھوں کو تاؤ دینے لگا تو زرینہ نے دل ہی دل میں اس پر لعنت بھیجی۔

''مگر اس کے مرنے کے بعد تو ساری جائداد......''

''اس کا بھی بندوبست کر دیا ہے میں نے۔'' وہ خباثت سے دانت نکوسنے لگا۔

''وہ کیا؟'' زرمینہ بے ساختہ پوچھ بیٹھی تھیں۔ مہران شاہ نے بڑی عجیب سی نظروں سے انہیں دیکھا۔

''آپ اتنی دلچسپی کیوں لے رہی ہیں؟ میں نے تو سنا تھا میرب آپ کو بہت پیاری ہے پھر اس کے مرنے کی آپ کو اتنی جلدی کیوں ہے؟'' وہ بھی ایک کائیاں تھا۔ زرمینہ داد دیئے بغیر نہ رہ سکیں۔

''مجھے بھلا اس سے ہمدردی کیوں ہونے لگی۔ تم نے نہیں بتانا' نہ بتاؤ' جو ہوگا سب کے سامنے آ جائے گا۔'' وہ خود کو لاتعلق ظاہر کرتیں آگے بڑھ گئیں۔ مہران شاہ پرسوچ انداز میں انہیں جاتا دیکھتا رہا پھر سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔

شیکسپیئر نے کہا تھا کہ ''محبت کی تکمیل یہ نہیں کہ جب دو لوگ ایک دوسرے کو پسند کرنے لگیں' محبت کی تکمیل تو یہ ہے کہ جب ایک نظر انداز کرے اور دوسرا پھر بھی اسے چاہے جائے۔ اپنی زندگی کی آخری سانس تک۔'' اور مجھے بھی...... یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ میں سالار آفندی کی محبت میں بری طرح گرفتار ہو چکی ہوں۔ جانتی ہوں وہ مجھ پر ایک نظر بھی ڈالنے کا روادار نہیں ہے۔ مجھ سے شدید نفرت کرتا ہے۔ اس کے باوجود بھی میرا دیوانہ دل اس کی جانب ہمکتا ہے۔ اپنے دل کی اس گستاخی پر میں نے بارہا اس کی سرزنش کی ہے مگر یہ دل ہے کہ مانتا ہی نہیں۔

ایک اور جگہ لکھا تھا۔

میں بھول جاؤں تمہیں
اب یہی مناسب ہے
مگر بھلانا بھی چاہوں تو کس طرح بھولوں
کہ تم تو پھر بھی حقیقت ہو
کوئی خواب نہیں
یہاں تو دل کا یہ عالم ہے کیا کہوں
بھلا نہ پایا' یہ وہ سلسلہ
جو تھا ہی نہیں
وہ اک خیال
جو آواز تک گیا ہی نہیں
وہ ایک بات
جو میں کہہ نہیں سکی تم سے
وہ ایک ربط
جو ہم میں کبھی رہا ہی نہیں۔
مجھے ہے یاد وہ سب
جو کبھی ہوا ہی نہیں

سالار کو لگا صفحہ قرطاس پر بکھرے یہ موتی' یہ الفاظ' الفاظ نہیں اس کے اپنے دل کی بھی آواز ہیں۔ دو دن سے میرب کا کچھ پتا نہیں تھا۔ داجی پریشانی میں بستر سے جا لگے تھے۔ ان کی ایک ہی رٹ تھی کہ میری میرو کو لے آؤ' میں جانتا ہوں اسے اس کے تایا نے اغواء کیا ہے۔'' اور وہ بے بس سا ہو جاتا۔ میرب احسان کی یہ ڈائری وہ پوری پڑھ چکا تھا۔ تھی تو غیر اخلاقی حرکت مگر اس میں جو انکشاف تھا وہ سالار آفندی کی زندگی کے لئے شاید سب سے بڑا سچ تھا۔

میں' سالار خان آفندی' شروع سے ہی خاصا اکھڑ اور بدمزاج مشہور تھا۔ داور کا مزاج مجھ سے بہت مختلف تھا۔ ماں باپ کے بعد داجی ہی

ہمارے سب کچھ ہیں۔ داور کی اچانک موت نے میرے حواس مختل کر دیئے تھے۔ جان سے پیارے بھائی کی دائمی جدائی نے میرے اندر سناٹے سما دیئے تھے۔ میرب احسان، بے ضرر سی لڑکی تھی۔ مگر جب مجھے معلوم ہوا کہ اس لڑکی کی وجہ سے میرا بھائی مارا گیا ہے تو تب مجھے میرب احسان سے اتنی نفرت محسوس ہوئی کہ جی چاہا اس کو دھکے دے کر گھر سے نکال دوں۔ جانے کون تھی اور کہاں سے آئی تھی، داور کو اس سے ہمدردی مہنگی پڑ گئی تھی۔ پتا نہیں اس نے داجی پر کیا جادو کیا تھا کہ وہ اس کی خاطر مجھ سے بھی الجھ پڑتے تھے، دن بدن مجھے اس لڑکی سے نفرت ہوتی جا رہی تھی اور وہ تھی کہ روز بروز داجی کی کمزوری بنتی جا رہی تھی۔ داور کی منگیتر پلوشے کے بھائیوں نے ایک روز اچانک مجھ پر حملہ کر دیا تھا۔ جانے وہ لوگ کونسی دشمنی پالے بیٹھے تھے۔ اور تب مجھ پر انکشاف ہوا کہ داور کو مروانے میں بھی انہی لوگوں کا ہاتھ تھا۔ بہن کی خودکشی کا سبب وہ ہم لوگوں کو سمجھتے تھے۔ حالانکہ رشتہ توڑنے کی بات بھی ان لوگوں نے خود ہی کی تھی۔ اس قاتلانہ حملے میں میں بچ تو گیا مگر دل و دماغ بدلنے لگے تھے۔ میرب احسان بالکل اچانک مجھے اچھی لگنے لگی تھی۔ وہ لمحہ، جب میرے زخمی ہونے پر وہ پریشان ہو کر میرے قریب آئی تھی، اس سمے اس کی آنکھوں میں کتنی فکر اور پروا تھی۔ صرف میرے لئے...... اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، میرے لئے۔ جب تک میں ہاسپٹل میں رہا وہ میری تیمارداری کرتی رہی اور ایک رات مجھے سوتا سمجھ کر اس نے اپنا حال دل بیان کیا تو میں ششدر رہ گیا۔ یقین کی مہر تب ثبت ہوئی جب میں نے اسے صارم رضا کے ساتھ کھڑے دیکھا۔ اس سمے مجھے شدید جیلسی محسوس ہوئی۔ جی چاہا صارم کو وہاں سے ہٹا دوں اور جب داجی نے بتایا کہ میرب کے لئے صارم رضا نے اپنا رشتہ بھیجا ہے تو میں ایک لمحے کو سناٹوں کی زد میں آ گیا۔

''داجی، میرب ہماری غیرت ہی، ہماری عزت ہی، اس کی شادی کا آپ سوچ بھی کیسے سکتے ہیں؟'' میں خود بھی نہیں جانتا تھا یہ الفاظ میرے لبوں سے کیسے نکلے۔ داجی نے بڑی جانچتی نگاہوں سے مجھے دیکھا، جیسے کہہ رہے ہوں ''بڑی جلدی خیال آ گیا کہ وہ اس گھر کی عزت ہے۔'' میں بے ساختہ نظریں چرا گیا۔

''اس کے آگے پہاڑ کی سی زندگی پڑی ہے جب تک میں زندہ ہوں، تب تک تو وہ یہاں رہ سکتی ہے مگر میرے بعد وہ در در کی ٹھوکریں کھاتی پھرے، یہ ہمیں گوارا نہیں ہے۔ ہم اپنی زندگی میں ہی اس کے فرض سے سبکدوش ہو جانا چاہتے ہیں۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں اتنے بڑے بڑے دکھ دیکھے ہیں بچی نے۔''

''داجی...... مگر...... صارم رضا......'' میں کچھ الجھ سا گیا تھا۔ دل جانے کیوں یہ سب قبول نہ کر پا رہا تھا۔

''کیا اگر مگر...... صارم رضا میں کیا برائی ہے، اچھا، دیکھا بھالا لڑکا ہے۔ خاندان بھی ٹھیک ہے مگر...... اس کی ماں مجھے دل سے رضامند نہیں لگ رہی تھی۔ خیر...... لڑکا تو راضی ہے ناں۔ ماں بھی راضی ہو جائے گی۔ میرو تو اتنی اچھی بچی ہے کہ کوئی اس سے خفا رہ ہی نہیں سکتا۔ سوائے تمہارے۔''

''افوہ...... داجی...... آپ......'' میں جھلا گیا۔

''تم کیوں اتنی اہمیت دے رہے ہو میرب احسان کو۔ تمہارے سر سے تو بلا ٹلی۔ تم تو خود ہی چاہتے تھے ناں کہ وہ اس گھر سے چلی جائے۔ پھر اب ایسا کیوں کر رہے ہو؟ اور تب میں لاجواب سا ہو کر وہاں سے چلا گیا۔ چند روز تک عجیب سی کشمکش میں مبتلا رہا۔ میرب کے چہرے پر کسی بھی قسم کا تاثر نہیں تھا۔ وہ خوش تھی نہ اداس، تب میں اس سے الجھ پڑا تو وہ بھی گویا پھٹ پڑی اور پہلی بار اس کے آنسو میرے دل پر گر رہے تھے اور تب داجی نے مجھ سے التجا کی کہ میں میرب سے نکاح کر لوں۔ اپنے بوڑھے دادا کا یہ التجائیہ انداز دیکھ کر میں ندامت سے زمین میں گڑ گیا۔ گویا میں اتنا بدتمیز اور اکھڑ ہوں کہ میرے دادا کو بھی مجھے حکم نہیں بلکہ درخواست کرنی پڑی اور تب میں نے تمام فیصلوں کا اختیار داجی کو سونپ دیا۔ میں نے دیکھا داجی کی آنکھیں فرط جذبات سے چمکنے لگی تھیں۔ وہ بے تحاشا خوش تھے اور میں ان کی خوشی میں ان سے زیادہ خوش تھا۔

''ٹرن...... ٹرن......'' فون بجنے پر میں خیالات کی یورش سے باہر نکلا۔

''السلام علیکم...... جی...... سالار آفندی بول رہا ہوں''

''کون زرمینہ گل؟ پھوپو؟''

''واٹ؟ آپ مجھے پتہ لکھوائیے۔'' رائٹنگ پیڈ پر وہ دوسری طرف سے لکھوایا جانے والا پتہ لکھنے لگا۔ یوں لگا گویا بدن میں جان پڑنے لگی ہو۔

❀❀❀

''میں کہتا ہوں سیدھی طرح میرب کو میرے حوالے کر دیں آپ لوگ۔'' سالار خان کے لہجے میں اژدھے کی سی پھنکار تھی۔

''وہ یہاں سے نہیں جائے گی۔ تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ چپ چاپ واپس لوٹ جاؤ۔'' مہران شاہ غرایا تھا۔

''میں میرب کو لے کر ہی یہاں سے جاؤں گا۔'' سالار خان آگے بڑھا۔ ''چلو میرب'' حواس باختہ کھڑی میرب کا بازو تھام کر کھینچا۔

''تم اسے یہاں سے نہیں لے جا سکتے۔'' مہران شاہ نے میرب کا دوسرا بازو تھام کر اپنی طرف کھینچا تو سالار آفندی کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

''میں دیکھتا ہوں کون روکتا ہے مجھے۔''

''رک جاؤ...... ورنہ میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔'' مہران شاہ نے ریوالور سالار خان پر تان لیا تو میرب جی جان سے لرز گئی۔

''ہم ان کھلونوں سے ڈرنے والے نہیں ہیں۔'' سالار کا لہجہ اٹل تھا۔ وہ میرب کا بازو تھام کر آگے بڑھا۔

''ٹھاہ ٹھاہ...... ٹھاہ......'' یکے بعد دیگرے تین فائر ہوئے تھے۔

''نہیں......'' میرب زوردار چیخ مار کر اٹھ بیٹھی تھی۔ پورا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ دل کی دھڑکن کانوں میں سنائی دے رہی تھی۔ تنفس تیز تر ہو رہا تھا۔

''یا اللہ یہ کیسا خواب تھا'' وہ سہم گئی تھی۔ ''تائی جان...... ہاں میں تائی جان کو منع کر دوں گی وہ سالار کو فون نہ کریں۔ پہلے میری وجہ سے داور...... اور اب سالار...... نہیں، نہیں...... میں خود کو قربان کر ڈالوں گی مگر داجی کو اور دکھ نہیں سہنے دوں گی۔'' مارے اضطراب کے اس کا بے چین دل سینے کی دیواروں سے ٹکرانے لگا اور وہ بے بس سی اسی قید خانے میں محض پھڑپھڑا کر رہ گئی۔

صبح تک وہ سجدے میں گری خدا سے رحم کی بھیک مانگتی رہی۔ سالار کی سلامتی کی دعائیں، اپنی عزت کی بقا کی دعائیں۔ داجی کی خوشیوں کے دوام کی دعائیں، رو رو کر آنکھیں سوج گئی تھیں۔ زرمینہ پھر دوبارہ وہاں آئی ہی نہیں تھیں۔ تبھی فیصلے کی گھڑی آن پہنچی۔ مہران شاہ اسے اس زنداں سے نکالنے آ پہنچا تھا۔ سبحان شاہ، فیضان شاہ، شہر بانو، زرمینہ، کامران شاہ، سبھی وہاں موجود تھے۔

''چٹاخ......'' ابھی وہ سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ سبحان شاہ کا بھاری ہاتھ اس کے بائیں گال پر نشان ثبت کر گیا۔

''کہا تھا ہم نے اس کے باپ سے کہ لڑکی ذات کو کالجوں میں مت بھیج، اب دیکھ لیا اس کا انجام، شکر کر تیرا باپ تیرے ان کالے کرتوتوں کو دیکھنے سے پہلے ہی مر گیا۔ گھٹیا عورت کی گھٹیا اولاد۔'' شہر بانو کی زبان زہر اگل رہی تھی۔

''خبردار کسی نے میری ماں کو گالی دی۔ گھٹیا وہ نہیں گھٹیا آپ لوگ ہیں۔'' جانے اتنی ہمت اس میں کہاں سے آ گئی تھی۔ ایک لمحے کو سبھی اس کی اس جرات پر گنگ رہ گئے۔ بالکل غیر متوقع سی صورت حال تھی۔

''اداسائیں...... وقت ضائع نہ کریں۔ جلدی سے کاغذات پر دستخط کروائیں۔ پھر جرگے والے بھی انتظار کر رہے ہوں گے۔'' فیضان شاہ کا لہجہ اکتاہٹ بھرا تھا۔

''تایا سائیں، کچھ تو خدا کا خوف کریں۔ میں آپ کی بھی کچھ لگتی ہوں۔ آپ کے بھائی کا خون ہوں۔ میرا قصور ثابت کیے بغیر مجھے کیسے سزا دے سکتے ہیں آپ لوگ۔ تائی جان...... آپ بھی تو کچھ بولیے۔'' وہ فیضان شاہ اور مہر بہ لب کھڑی زرمینہ کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس کا گداز لہجہ فیضان شاہ کے دل پر اثر کرنے لگا۔

''بہت خوب، یہ لڑکی تو ہمارے اندازوں سے زیادہ چلتر اور ڈرامہ باز ہے۔'' سبحان شاہ کے لبوں سے زہر میں بجھے الفاظ ادا ہوئے۔

''یہاں دستخط کرو۔'' چند کاغذات اس کے سامنے رکھے گئے۔ شہر بانو اور فیروزہ نے اسے تھام کر صوفے پر بٹھایا اور خود اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئیں۔ شہر بانو نے سرخ گوٹا لگا دوپٹہ اس کے سر پر اوڑھا دیا۔ آناً فاناً مولوی صاحب کو اندر لایا گیا۔ زرمینہ چپ چاپ بے بس سی

کھڑی یہ تمام کارروائی دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے ایک لاچارسی نظر ہاتھ میں پکڑے موبائل فون پر ڈالی اور دوسری نظر میرب پر جو شہر بانو اور فیروزہ کے شکنجے میں تھی۔

''مہران شاہ ولد سبحان شاہ بعوض حق مہر......''

''یہ سب گناہ ہے۔ میرا نکاح پہلے ہی ہو چکا ہے۔ میں کسی کی منکوحہ ہوں۔'' مولوی صاحب کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ چلائی تو مولوی صاحب حیرت سے سبحان شاہ کی طرف دیکھنے لگے۔

''بکواس کر رہی ہے یہ، آپ نکاح پڑھائیں۔''

''میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میرا نکاح ہو چکا ہے۔''

''اچھا......کوئی ثبوت ہے تمہارے پاس۔ کہاں ہے وہ نکاح نامہ؟ کہاں ہے تمہارا شوہر؟'' مہران شاہ نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ وہ بے بسی سے لب کچل کر رہ گئی۔

''چلو...... یہاں دستخط کرو۔'' سبحان شاہ نے ریوالور نکال کر اس کا رخ میرب کی طرف کر دیا۔

''میں دستخط نہیں کروں گی، تایا سائیں، جس جائداد کی خاطر آپ یہ گناہ کر رہے ہیں وہ تو پھر بھی آپ کو نہیں لینے دوں گی میں۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ تبھی باہر سے شور کی آوازیں آنے لگیں۔ دروازہ زور زور سے بجایا گیا۔ مہران شاہ نے دروازہ کھولا تو اندر آنے والے کو دیکھ کر میرب کے اندر گویا بجلی سی بھر گئی۔

''سالار...... مجھے بچالو۔'' یکلخت وہ دوڑتی ہوئی اس کے سینے سے آ لگی تھی۔ سالار نے اس کو اپنے حصار میں لے لیا۔ سالار کے ساتھ پوری پولیس پارٹی تھی۔ ایس پی منیب حسن اس کا گہرا دوست تھا۔ سالار نے اس کی مدد لی تھی۔

''ایس پی تم بیچ میں مت آؤ۔ یہ ہمارا خاندانی معاملہ ہے۔'' سبحان شاہ ایس پی منیب کو دیکھتے ہی بول پڑے۔

''قانون ایسی کسی بات کو نہیں مانتا۔''

''اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ابھی آپ نے یہ بے حیائی کا نظارہ۔ ایک لڑکی کا کسی نامحرم کے گلے لگنا کہاں جائز ہے؟''

''بے حیائی؟ بے حیائی یہ نہیں بے حیائی تو وہ ہے جو ابھی آپ لوگ کر رہے تھے۔ میرب میری بیوی ہے۔ میری عزت ہے۔ میں ہوں اس کا محرم، ثبوت چاہئے تو یہ رہا ہمارا نکاح نامہ۔'' ٹھوس لہجے میں بولتا وہ سب کی زبانوں کو بند کر گیا۔

''شاہ صاحب......نکاح پر نکاح کروانے کا جرم آپ پر ثابت ہو چکا ہے۔'' ایس پی نے اضافہ کیا۔

''تم اس کو یہاں سے ایسے نہیں لے جا سکتے۔'' بالکل اچانک مہران شاہ نے سالار پر ریوالور تان لیا تھا۔

''آپ قانون کو ہاتھ میں لینے کی غلطی کر رہے ہیں۔'' ایس پی نے وارننگ دی۔

''میرب میری منگیتر ہے۔ میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔'' مہران شاہ کے سر پر گویا جنون سوار ہو گیا تھا۔ میرب کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ رات کو دیکھا ہو خواب اپنی پوری جزئیات سمیت نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔

''نہیں......تم سالار کو نہیں مار سکتے۔ میں...... میں......'' وہ سالار کے آگے تن کر کھڑی ہو گئی تھی۔

میرب نے دونوں بازو یوں پھیلا دیئے گویا سالار کو اپنی پشت پر چھپا دینا چاہتی ہو۔

''ٹھاہ ٹھاہ......'' دو فائر ہوئے تھے۔

''نہیں'' شہر بانو کی چیخ سب سے بلند تھی۔ مہران کے فائر کھولنے سے ایک لمحہ پہلے بجلی کی سی تیزی سے زرینہ میرب کے سامنے آ گئی تھیں۔ گولی سیدھا ان کے دل میں اتر گئی تھی اور ایس پی منیب حسن جو کافی دیر سے مہران کو وارننگ دے رہے تھے۔ ان کے ریوالور سے نکلی گولی مہران کا سینہ چیر گئی۔ جوان بیٹے کی موت کا صدمہ سبحان شاہ کا دل سہار نہ پایا تھا۔ اور وہ اسی وقت ڈھے گئے تھے۔ جس دولت کی خاطر اتنے دل دکھائے، خدا اور رسولؐ کے حکم کی نافرمانی کی، وہ بھی انہیں اس ذلت بھری موت سے نہ بچا پائی تھی۔ شہر بانو کا سارا کروفر اور

طنطنہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ اس واقعے کا اثر ان کے دماغ پر ہو گیا تھا۔ بہکی بہکی باتیں کرتی رہتی تھیں۔ فیضان شاہ سچے دل سے تائب ہو گئے تھے۔ زرینہ کی موت کا بھی انہیں گہرا صدمہ پہنچا تھا۔ میرب اسی وقت سالار کے ساتھ چلی جاتی اگر فیضان شاہ اسے روک نہ لیتے۔ انہوں نے میرب سے معافی مانگی تو وہ تڑپ اٹھی۔ رشتوں کا احترام کرنے والی صاف دل سی لڑکی تھی وہ۔ سبحان شاہ زرینہ اور مہران کے سوئم تک وہ حویلی میں ہی رہی تھی۔ جلال خان بیٹی کی موت کی خبر سن کر رہ نہیں سکے تھے۔ وہ تو سمجھتے تھے وہ ان کے لئے اسی دن مر گئی تھی جب اس نے باپ کی دہلیز کی مٹی چھوڑی تھی مگر اب......سالار خان نے جو خبر سنائی تھی تو وہ رہ نہ پائے تھے۔ بیٹی کو جیتے جی نہ دیکھنے کی جو قسم کھائی تھی' اس پر قائم نہ رہ سکے تھے۔ سوئم کے بعد جب جلال خان' میرب کو لینے آئے تو فیضان شاہ نے بڑی لجاجت سے ان کے ہاتھ تھام لئے۔

''میرب اس گھر کی بیٹی ہے۔ میں چاہتا ہوں اسے بڑی شان سے اس گھر سے رخصت کروں۔ مانتا ہوں مجھ سے بڑی کوتاہیاں ہوئیں مگر قدرت نے مجھے ان غلطیوں کے ازالے کا ایک موقع دیا ہے جو میں گنوانا نہیں چاہتا۔'' زرینہ زندہ ہوتیں تو یہ منظر دیکھ کر ویسے ہی خوشی سے مر جاتیں۔

''ٹھیک ہے برخوردار مگر اب ہم زیادہ انتظار نہ کر پائیں گے۔'' جلال خان کی رضامندی پر سالار کچھ تذبذب کا شکار نظر آ رہا تھا۔

''جانتا ہوں تمہارا دل ابھی بھی بے اعتبار ہے۔ مگر ہمارا یقین کرو بیٹا' میرب تمہاری امانت ہے اور میں اس میں خیانت نہیں کروں گا۔ میری بھتیجی نہیں بیٹی ہے وہ۔'' فیضان شاہ نے گویا اس کی سوچ پڑھ لی تھی۔ وہ شرمندہ سا ہو گیا۔ دو ماہ بعد رخصتی کی تاریخ طے کر دی گئی۔

❀❀❀

وہ جو تقدیر سے شکوہ کناں تھی۔ ایک دم سے قسمت میں در آنے والی اتنی بڑی تبدیلی پر ابھی تک انگشت بدنداں تھی۔ زندگی نے اتنے دکھ دیئے تھے کہ اب ایکدم سے اتنی خوشیاں وہ سنبھال نہ پا رہی تھی۔ سادہ مگر پروقار تقریب میں اسے سالار خان آفندی کے ہمراہ رخصت کیا گیا تھا۔ ان دو ماہ میں فیضان شاہ نے اسے اتنی عزت' اتنا مان اور پیار دیا تھا کہ اسے اس زندگی سے جتنے بھی شکوے تھے' سب دور ہو گئے تھے۔ انہوں نے ایک باپ کی طرح اسے رخصت کیا تھا۔ سالار خان نے جہیز لینے سے انکار کر دیا تھا۔ رخصتی کے وقت فیضان شاہ نے میرب کے حصے کی ساری جائداد کے کاغذات اس کے حوالے کر دیئے تھے۔ سالار اس کے حق میں نہیں تھا مگر فیضان شاہ کا یہ کہنا......''یہ ہم باپ بیٹی کا معاملہ ہے۔'' اسے مسکرانے پر مجبور کر گیا تھا۔

کچھ خواب ہیں جن کو لکھنا ہے
تعبیر کی صورت دینی ہے
کچھ لوگ ہیں اجڑے دل والے
جنہیں اپنی محبت دینی ہے
کچھ پھول ہیں جن کو چننا ہے
اور ہار کی صورت دینی ہے
کچھ اپنی نیندیں باقی ہیں
جنہیں بانٹنا ہے کچھ لوگوں میں
ان کو بھی تو راحت دینی ہے
اے عمر رواں!
آہستہ چل!
ابھی خاصا قرض چکانا ہے......!

گمبھیر لہجہ سماعتوں میں رس گھول رہا تھا۔اس کی توقع کے برعکس سالار کا رویہ خاصا حوصلہ افزا تھا۔وہ جواب تک بدترین خدشات میں گھری تھی اور یہ سمجھتی تھی کہ یہ شادی سالار نے داجی کے مجبور کرنے پر کی ہے۔اسے اپنے سارے خدشات ریت کی دیوار کی طرح گرتے ہوئے محسوس ہوئے۔سالار نے اس کے گلے میں گولڈ کی چین پہناتے ہوئے یہ نظم پڑھی تھی۔

''بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔'' دائیں ہاتھ کی پشت پر دو سلگتے لب جار کے تھے۔اسے گویا دو سو والٹ کا کرنٹ لگا۔اپنی جگہ پر اچھل کر رہ گئی۔

''کیا ہوا؟'' کپکپاتے لب، اٹھتی گرتی پلکیں، ستواں ناک میں لشکارے مارتی ہیرے کی لونگ......سالار نے خاصے محظوظ کن انداز میں دیکھا تھا۔کل تک جس سے شدید نفرت کرتا تھا۔آج اسی کے ساتھ ایک ایسے اٹوٹ اور مضبوط تعلق میں بندھا تھا کہ دل خود بخود بے خود ہوا چاہتا تھا۔

''کچھ تو کہو۔مجھ سے پوچھو گی نہیں کہ یہ کایا پلٹ کیسے ہوئی؟ ہر آن، ہر لمحہ انگارے برساتے لب اس وقت پھول کیوں بکھیر رہے ہیں؟ میرب! کہتے ہیں کہ بہت شدید نفرت بعض اوقات بہت شدید محبت پر آ کر ختم ہوتی ہے اور دیکھو ایسا ہی ہوا ہے۔میں کھرا اور تھوڑا بددماغ سا بندہ ہوں۔میں یہ نہیں کہتا کہ مجھے تم سے کوئی طوفانی قسم کا عشق ہو گیا ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ جب داجی نے صارم کے رشتے کی بات کی تو مجھے شدید جلن ہوئی۔مجھے یقین ہے کہ بہت جلد میں تم سے طوفانی قسم کا عشق بھی کرنے لگ جاؤں گا۔جیسے کہ تم مجھ سے کرتی رہی ہو۔'' آخری بات شرارت سے لبریز تھی۔میرب نے چونک کر پلکوں کی چلمن اٹھائی تھی۔

''سوری......مگر میں تمہاری ڈائری پڑھ چکا ہوں۔'' وہ نادم سا ہوا۔

''اوہ، جبھی......'' وہ گویا جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔

''اب یہ مت سمجھ لینا کہ تمہاری ڈائری پڑھنے کے بعد میں تم سے شادی پر رضامند ہوا ہوں۔'' اس نے گویا میرب کے دل کا حال جان لیا تھا۔

''تم بہت اچھی ہو میرب، آج ہم اپنی نئی زندگی کی شروعات کرنے جا رہے ہیں، میرا رویہ، میرا سلوک تمہارے ساتھ یقیناً بہت برا تھا، جس کے لئے میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔''

''پلیز آپ مجھے شرمندہ مت کیجئے۔''

''تم واقعی بہت اچھی لڑکی ہو اور میں پوری کوشش کروں گا کہ اس اچھی لڑکی کو زندگی کی ہر وہ خوشی دوں، جو یہ اچھی لڑکی چاہتی ہے اور یہ کہ اچھی لڑکی، ابھی بہت سی باتیں ہیں جو تم کو سنانی ہیں مگر وہ ساری باتیں پھر کبھی سہی، کیونکہ آج کی یہ رات بہت خاص ہے جس کے ایک ایک لمحے کو میں یادگار بنانا چاہتا ہوں۔'' سالار نے اس کی طرف جھک کر شوخ سی جسارت کر ڈالی جس پر اس کے چہرے پر گلال سمٹ آیا۔

''بلیومی، تمہارے چہرے پر چھائی یہ سرخی، یہ منظر اتنا حسین ہے کہ......''

میرب نے ایک لمحے کو اس کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر اس کی نظروں کا مفہوم سمجھ کر شرما کر اس کے کشادہ سینے میں چہرہ چھپا لیا۔حیا کا یہ دلفریب منظر سالار آفندی کو مسرور کر گیا۔اور اس کی مضبوط بانہوں میں، اس کے سینے سے لگی میرب کا رواں رواں اللہ کے حضور شکر گزار تھا۔زندگی کی اتنی سختیاں اور تلخیاں سہنے کے بعد سالار آفندی کا ساتھ اسے اپنے رب کی طرف سے صبر کا میٹھا پھل لگ رہا تھا اور سالار بھی اس لمحے میرب کا ساتھ پا کر سوچ رہا تھا کہ یہ پیاری سی لڑکی اس کے لئے اللہ کی طرف سے کسی نیکی کا انعام ہے۔

دھنک کے پل پہ چل کے
گگن کے پار جاتے ہیں
چلو ہم ہار جاتے ہیں......

وہ دھیرے سے اس کے کان میں گنگنایا تو وہ سمٹ کر رہ گئی۔

ختم شد